

عمر گزرے گی امتحان میں کیا  
 داغ ہی دیں گے مجھ کو دان میں کیا  
 میری ہر بات ہے اثر ہی رہی  
 نقص ہے کچھ مرے بیان میں کیا  
 مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں  
 یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا  
 اپنی محرومیاں چھپاتے ہیں  
 ہم غریبوں کی آن بان میں کیا  
 خود کو جانا جدا زمانے سے  
 آگیا تھا مرے گمان میں کیا  
 شام ہی سے دکان دید ہے بند  
 نہیں نقصان تک دکان میں کیا  
 اے مرے صبح و شام دل کی شفق  
 تو نہاتی ہے اب بھی بان میں کیا  
 بولتے کیوں نہیں مرے حق میں  
 آبلے بڑ گئے زبان میں کیا  
 خامشی کہہ رہی ہے کان میں کیا  
 آ رہا ہے مرے گمان میں کیا  
 دل کہ آتے ہیں جس کو دھیان بہت  
 خود بھی آتا ہے اپنے دھیان میں کیا  
 وہ ملے تو یہ پوچھنا ہے مجھے  
 اب بھی ہوں میں تری امان میں کیا  
 یوں جو نکتا ہے آسمان کو تو  
 کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا  
 بے نسیم بہار گرد آلود  
 خاک اڑتی ہے اس مکان میں کیا  
 یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا  
 ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا  
 نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم  
 بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم  
 خموشی سے ادا ہو رسم دوری  
 کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم  
 یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں  
 وفا داری کا دعویٰ کیوں کریں ہم  
 وفا اخلاص قربانی محبت  
 اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم  
 سنا دیں عصمت مریم کا قصہ  
 پر اب اس باب کو وا کیوں کریں ہم  
 زلیخانے عزیزاں بات یہ ہے  
 بھلا گھاٹے کا سودا کیوں کریں ہم  
 ہماری ہی تمنا کیوں کرو تم  
 تمہاری ہی تمنا کیوں کریں ہم  
 کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے  
 تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم  
 اٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں  
 فقط کمروں میں ٹھلا کیوں کریں ہم  
 جو اک نسل فرومایہ کو پہنچے  
 وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم  
 نہیں دنیا کو جب پروا ہماری  
 تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم

بربنہ ہیں سر بازار تو کیا  
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم  
ہیں باشندے اسی بستی کے ہم بھی  
سو خود پر بھی بھروسا کیوں کریں ہم  
چبا لیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچہ  
تمہیں راتب مہیا کیوں کریں ہم  
پڑی ہیں دو انسانوں کی لاشیں  
زمین کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم  
یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی  
یہاں کار مسیحا کیوں کریں ہم  
کتنے عیش سے رہتے ہوں گے کتنے اتراتے ہوں گے  
جانے کیسے لوگ وہ ہوں گے جو اس کو بھاتے ہوں گے  
شام ہوئے خوش باش یہاں کے میرے پاس آ جاتے ہیں  
میرے بچھنے کا نظارہ کرنے آ جاتے ہوں گے  
وہ جو نہ آنے والا ہے نا اس سے مجھ کو مطلب تھا  
آنے والوں سے کیا مطلب آتے ہیں آتے ہوں گے  
اس کی یاد کی باد صبا میں اور تو کیا ہوتا ہوگا  
یوں ہی میرے بال ہیں بکھرے اور بکھر جاتے ہوں گے  
یارو کچھ تو ذکر کرو تم اس کی قیامت بانہوں کا  
وہ جو سمٹتے ہوں گے ان میں وہ تو مر جاتے ہوں گے  
میرا سانس اکھڑتے ہی سب بین کریں گے روئیں گے  
یعنی میرے بعد بھی یعنی سانس لیے جاتے ہوں گے  
بے قراری سی بے قراری ہے  
وصل ہے اور فراق طاری ہے  
جو گزاری نہ جا سکی ہم سے  
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے  
نگھرے کیا ہوئے کہ لوگوں پر  
اپنا سایہ بھی اب تو بھاری ہے  
بن تمہارے کبھی نہیں آئی  
کیا مری نیند بھی تمہاری ہے  
آپ میں کیسے آؤں میں تجھ بن  
سانس جو چل رہی ہے آری ہے  
اس سے کہیو کہ دل کی گلیوں میں  
رات دن تیری انتظار ہے  
بجر ہو یا وصال ہو کچھ ہو  
ہم ہیں اور اس کی یادگاری ہے  
اک مہک سمت دل سے آئی تھی  
میں یہ سمجھا تری سواری ہے  
حادثوں کا حساب ہے اپنا  
ورنہ ہر آن سب کی باری ہے  
خوش رہے تو کہ زندگی اپنی  
عمر بھر کی امیدواری ہے  
حالت حال کے سبب حالت حال ہی گئی  
شوق میں کچھ نہیں گیا شوق کی زندگی گئی  
تیرا فراق جان جاں عیش تھا کیا مرے لیے  
یعنی ترے فراق میں خوب شراب پی گئی  
تیرے وصال کے لیے اپنے کمال کے لیے  
حالت دل کہ تھی خراب اور خراب کی گئی  
اس کی امید ناز کا ہم سے یہ مان تھا کہ آپ  
عمر گزار دیجیے عمر گزار دی گئی

ایک ہی حادثہ تو ہے اور وہ یہ کہ آج تک  
بات نہیں کہی گئی بات نہیں سنی گئی  
بعد بھی تیرے جان جاں دل میں رہا عجب سماں  
یاد رہی تری یہاں پھر تری یاد بھی گئی  
اس کے بدن کو دی نمود ہم نے سخن میں اور پھر  
اس کے بدن کے واسطے ایک قبا بھی سی گئی  
مینا ہم مینا مے ہم مے جام ہم جام ہم جم  
ناف پیالے کی ترے یاد عجب سہی گئی  
کہنی ہے مجھ کو ایک بات آپ سے یعنی آپ سے  
آپ کے شہر وصل میں لذت بھر بھی گئی  
صحن خیال یار میں کی نہ بسر شب فراق  
جب سے وہ چاندنا گیا جب سے وہ چاندنی گئی  
ہے دلی کیا یوں ہی دن گزر جائیں گے  
صرف زندہ رہے ہم تو مر جائیں گے  
رقص ہے رنگ پر رنگ ہم رقص ہیں  
سب بچھڑ جائیں گے سب بکھر جائیں گے  
یہ خرابائیاں خرد باختہ  
صبح ہوتے ہی سب کام پر جائیں گے  
کتنی دل کش ہو تم کتنا دلجو ہوں میں  
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے  
ہے غنیمت کہ اسرار بستی سے ہم  
ہے خبر آئے ہیں ہے خبر جائیں گے  
اپنے سب یار کام کر رہے ہیں  
اور ہم ہیں کہ نام کر رہے ہیں  
نیغ بازی کا شوق اپنی جگہ  
آپ تو قتل عام کر رہے ہیں  
داد و تحسین کا یہ شور ہے کیوں  
ہم تو خود سے کلام کر رہے ہیں  
ہم ہیں مصروف انتظام مگر  
جانے کیا انتظام کر رہے ہیں  
ہے وہ ہے چارگی کا حال کہ ہم  
ہر کسی کو سلام کر رہے ہیں  
ایک قتالہ چاہیے ہم کو  
ہم یہ اعلان عام کر رہے ہیں  
کیا بھلا ساغر سفال کہ ہم  
ناف پیالے کو جام کر رہے ہیں  
ہم تو آئے تھے عرض مطلب کو  
اور وہ احترام کر رہے ہیں  
نہ اٹھے آہ کا دھواں بھی کہ وہ  
کوئے دل میں خرام کر رہے ہیں  
اس کے ہونٹوں پہ رکھ کے ہونٹ اپنے  
بات ہی ہم تمام کر رہے ہیں  
ہم عجب ہیں کہ اس کے کوچے میں  
ہے سبب دھوم دھام کر رہے ہیں  
ٹھیک ہے خود کو ہم بدلتے ہیں  
شکریہ مشورت کا چلتے ہیں  
ہو رہا ہوں میں کس طرح برباد  
دیکھنے والے ہاتھ ملتے ہیں  
ہے وہ جان اب ہر ایک محفل کی  
ہم بھی اب گھر سے کم نکلتے ہیں

کیا تکلف کریں یہ کہنے میں  
جو بھی خوش ہے ہم اس سے جلتے ہیں  
ہے اسے دور کا سفر در پیش  
ہم سنبھالے نہیں سنبھلتے ہیں  
تم بنو رنگ تم بنو خوشبو  
ہم تو اپنے سخن میں ڈھلتے ہیں  
میں اسی طرح تو بہلتا ہوں  
اور سب جس طرح بہلتے ہیں  
ہے عجب فیصلے کا صحرا بھی  
چل نہ پڑے تو پاؤں جلتے ہیں  
گائے گائے بس اب یہی ہو کیا  
تم سے مل کر بہت خوشی ہو کیا  
مل رہی ہو بڑے تپاک کے ساتھ  
مجھ کو یکسر بھلا چکی ہو کیا  
یاد ہیں اب بھی اپنے خواب تمہیں  
مجھ سے مل کر اداس بھی ہو کیا  
بس مجھے یوں ہی اک خیال آیا  
سوچتی ہو تو سوچتی ہو کیا  
اب مری کوئی زندگی ہی نہیں  
اب بھی تم میری زندگی ہو کیا  
کیا کہا عشق جاودانی ہے  
آخری بار مل رہی ہو کیا  
ہاں فضا یاں کی سوئی سوئی سی ہے  
تو بہت تیز روشنی ہو کیا  
میرے سب طنز ہے اثر ہی رہے  
تم بہت دور جا چکی ہو کیا  
دل میں اب سوز انتظار نہیں  
شمع امید بجھ گئی ہو کیا  
اس سمندر پہ تشنہ کام ہوں میں  
ہاں تم اب بھی بہم رہی ہو کیا  
تمہارا بجر منا لوں اگر اجازت ہو  
میں دل کسی سے لگا لوں اگر اجازت ہو  
تمہارے بعد بھلا کیا ہیں وعدہ و پیمان  
بس اپنا وقت گنوا لوں اگر اجازت ہو  
تمہارے بجر کی شب بائے کار میں جاناں  
کوئی چراغ جلا لوں اگر اجازت ہو  
جنوں وہی ہے وہی میں مگر ہے شہر نیا  
یہاں بھی شور مچا لوں اگر اجازت ہو  
کسے ہے خوابش مریم گری مگر پھر بھی  
میں اپنے زخم دکھا لوں اگر اجازت ہو  
تمہاری یاد میں جینے کی آرزو ہے ابھی  
کچھ اپنا حال سنبھالوں اگر اجازت ہو  
سر ہی اب پھوڑے ندامت میں  
نہیں آنے لگی ہے فرق میں  
ہیں دلیلیں ترے خلاف مگر  
سوچتا ہوں تری حمایت میں  
روح نے عشق کا فریب دیا  
جسم کو جسم کی عداوت میں  
اب فقط عادتوں کی ورزش ہے  
روح شامل نہیں شکایت میں

عشق کو درمیاں نہ لاؤ کہ میں  
چپختا ہوں بدن کی عسرت میں  
یہ کچھ آسان تو نہیں ہے کہ ہم  
روٹھتے اب بھی ہیں مروت میں  
وہ جو تعمیر ہوئے والی تھی  
لگ گئی آگ اس عمارت میں  
زندگی کس طرح بسر ہوگی  
دل نہیں لگ رہا محبت میں  
حاصل کن ہے یہ جہان خراب  
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں  
پھر بنایا خدا نے آدم کو  
اپنی صورت پہ ایسی صورت میں  
اور پھر آدمی نے غور کیا  
چھپکلی کی لطیف صنعت میں  
اے خدا جو کہیں نہیں موجود  
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں  
اک ہنر ہے جو کر گیا ہوں میں  
سب کے دل سے اتر گیا ہوں میں  
کیسے اپنی ہنسی کو ضبط کروں  
سن رہا ہوں کہ گھر گیا ہوں میں  
کیا بتاؤں کہ مر نہیں پاتا  
جیتے جی جب سے مر گیا ہوں میں  
اب ہے بس اپنا سامنا در پیش  
ہر کسی سے گزر گیا ہوں میں  
وہی ناز و ادا وہی غمزے  
سر ہم سر آپ پر گیا ہوں میں  
عجب الزام ہوں زمانے کا  
کہ یہاں سب کے سر گیا ہوں میں  
کبھی خود تک پہنچ نہیں پایا  
جب کہ واں عمر بھر گیا ہوں میں  
تم سے جاناں ملا ہوں جس دن سے  
ہے طرح خود سے ڈر گیا ہوں میں  
کوئے جاناں میں سوگ برپا ہے  
کہ اچانک سدھر گیا ہوں میں  
ابھی اک شور سا اٹھا ہے کہیں  
کوئی خاموش ہو گیا ہے کہیں  
ہے کچھ ایسا کہ جیسے ہم سب کچھ  
اس سے بہلے بھی ہو چکا ہے کہیں  
تجھ کو کیا ہو گیا کہ چیزوں کو  
کہیں رکھتا ہے ڈھونڈتا ہے کہیں  
جو یہاں سے کہیں نہ جاتا تھا  
وہ یہاں سے چلا گیا ہے کہیں  
آج شمشان کی سی ہو ہے یہاں  
کیا کوئی جسم جل رہا ہے کہیں  
ہم کسی کے نہیں جہاں کے سوا  
ایسی وہ خاص بات کیا ہے کہیں  
تو مجھے ڈھونڈ میں تجھے ڈھونڈوں  
کوئی ہم میں سے رہ گیا ہے کہیں  
کتنی وحشت ہے درمیان ہجوم  
جس کو دیکھو گیا ہوا ہے کہیں

میں تو اب شہر میں کہیں بھی نہیں  
کیا مرا نام بھی لکھا ہے کہیں  
اسی کمرے سے کوئی بو کے وداع  
اسی کمرے میں چھپ گیا ہے کہیں  
مل کے ہر شخص سے ہوا محسوس  
مجھ سے یہ شخص مل چکا ہے کہیں  
بہت دل کو کشادہ کر لیا کیا  
زمانے بھر سے وعدہ کر لیا کیا  
تو کیا سچ مچ جدائی مجھ سے کر لی  
تو خود اپنے کو آدھا کر لیا کیا  
بہر مندی سے اپنی دل کا صفحہ  
مری جاں تم نے سادہ کر لیا کیا  
جو یکسر جان ہے اس کے بدن سے  
کہو کچھ استفادہ کر لیا کیا  
بہت کترا رہے ہو مہیچوں سے  
گناہ ترک بادہ کر لیا کیا  
یہاں کے لوگ کب کے جا چکے ہیں  
سفر جادہ بہ جادہ کر لیا کیا  
اٹھایا اک قدم تو نے نہ اس تک  
بہت اپنے کو ماندہ کر لیا کیا  
تم اپنی کچ کلابی بار بیٹھیں  
بدن کو بے لبادہ کر لیا کیا  
بہت نزدیک آتی جا رہی ہو  
بچھڑنے کا ارادہ کر لیا کیا  
ایک ہی مژدہ صبح لاتی ہے  
دھوپ آنگن میں پھیل جاتی ہے  
رنگ موسم ہے اور باد صبا  
شہر کوچوں میں خاک اڑاتی ہے  
فرش پر کاغذ اڑتے پھرتے ہیں  
میز پر گرد جمتی جاتی ہے  
سوچتا ہوں کہ اس کی یاد آخر  
اب کسے رات بھر جگاتی ہے  
میں بھی اذن نوا گری چاہوں  
بے دلی بھی تو لب ہلاتی ہے  
سو گئے پیڑ جاگ اٹھی خوشبو  
زندگی خواب کیوں دکھاتی ہے  
اس سراپا وفا کی فرقت میں  
خوابش غیر کیوں سناتی ہے  
آپ اپنے سے ہم سخن رہنا  
ہم نشیں سانس پھول جاتی ہے  
کیا ستم ہے کہ اب تری صورت  
غور کرنے پہ یاد آتی ہے  
کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے  
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے  
سینہ دہک رہا ہو تو کیا چپ رہے کوئی  
کیوں چیخ چیخ کر نہ گلا چھیل لے کوئی  
ثابت ہوا سکون دل و جاں کہیں نہیں  
رشتوں میں ڈھونڈھتا ہے تو ڈھونڈا کرے کوئی  
ترک تعلقات کوئی مسئلہ نہیں  
یہ تو وہ راستہ ہے کہ بس چل پڑے کوئی

دیوار جانتا تھا جسے میں وہ دھول تھی  
اب مجھ کو اعتماد کی دعوت نہ دے کوئی  
میں خود یہ چاہتا ہوں کہ حالات ہوں خراب  
میرے خلاف زہر اگلتا پھرے کوئی  
اے شخص اب تو مجھ کو سبھی کچھ قبول ہے  
یہ بھی قبول ہے کہ تجھے چھین لے کوئی  
ہاں ٹھیک ہے میں اپنی انا کا مریض ہوں  
آخر مرے مزاج میں کیوں دخل دے کوئی  
اک شخص کر رہا ہے ابھی تک وفا کا ذکر  
کاش اس زباں دراز کا منہ نوچ لے کوئی  
بڑا احسان ہم فرما رہے ہیں  
کہ ان کے خط انہیں لوٹا رہے ہیں  
نہیں ترک محبت پر وہ راضی  
قیامت ہے کہ ہم سمجھا رہے ہیں  
یقین کا راستہ طے کرنے والے  
بہت تیزی سے واپس آ رہے ہیں  
یہ مت بھولو کہ یہ لمحات ہم کو  
بچھڑنے کے لیے ملوا رہے ہیں  
تعجب ہے کہ عشق و عاشقی سے  
ابھی کچھ لوگ دھوکا کھا رہے ہیں  
تمہیں چاہیں گے جب چھن جاؤ گی تم  
ابھی ہم تم کو ارزاں پا رہے ہیں  
کسی صورت انہیں نفرت ہو ہم سے  
ہم اپنے عیب خود گنوا رہے ہیں  
وہ پاگل مست ہے اپنی وفا میں  
مری آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں  
دلیلوں سے اسے قائل کیا تھا  
دلہلیں دے کے اب پچھتا رہے ہیں  
تری بانہوں سے ہجرت کرنے والے  
نئے ماحول میں گھبرا رہے ہیں  
یہ جذب عشق ہے یا جذبہ رحم  
ترے آنسو مجھے رلوا رہے ہیں  
عجب کچھ ربط ہے تم سے کہ تم کو  
ہم اپنا جان کر ٹھکرا رہے ہیں  
وفا کی یادگاریں تک نہ ہوں گی  
مری جاں بس کوئی دن جا رہے ہیں  
آدمی وقت پر گیا ہوگا  
وقت پہلے گزر گیا ہوگا  
وہ ہماری طرف نہ دیکھ کے بھی  
کوئی احسان دھر گیا ہوگا  
خود سے مایوس ہو کے بیٹھا ہوں  
آج ہر شخص مر گیا ہوگا  
شام تیرے دیار میں آخر  
کوئی تو اپنے گھر گیا ہوگا  
مریم بجر تھا عجب اکسیر  
اب تو ہر زخم بھر گیا ہوگا  
ضبط کر کے ہنسی کو بھول گیا  
میں تو اس زخم ہی کو بھول گیا  
ذات در ذات ہم سفر رہ کر  
اجنبی اجنبی کو بھول گیا

صبح تک وجہ جاں کئی تھی جو بات  
میں اسے شام ہی کو بھول گیا  
عہد وابستگی گزار کے میں  
وجہ وابستگی کو بھول گیا  
سب دلیلیں تو مجھ کو یاد رہیں  
بحث کیا تھی اسی کو بھول گیا  
کیوں نہ ہو ناز اس ذہانت پر  
ایک میں ہر کسی کو بھول گیا  
سب سے پر امن واقعہ یہ ہے  
آدمی آدمی کو بھول گیا  
قہقہہ مارتے ہی دیوانہ  
ہر غم زندگی کو بھول گیا  
خواب با خواب جس کو چاہا تھا  
رنگ با رنگ اسی کو بھول گیا  
کیا قیامت ہوئی اگر اک شخص  
اپنی خوش قسمتی کو بھول گیا  
سوچ کر اس کی خلوت انجمنی  
واں میں اپنی کمی کو بھول گیا  
سب برے مجھ کو یاد رہتے ہیں  
جو بھلا تھا اسی کو بھول گیا  
ان سے وعدہ تو کر لیا لیکن  
اپنی کم فرصتی کو بھول گیا  
بستیو اب تو راستہ دے دو  
اب تو میں اس گلی کو بھول گیا  
اس نے گویا مجھی کو یاد رکھا  
میں بھی گویا اسی کو بھول گیا  
یعنی تم وہ ہو واقعی؟ حد ہے  
میں تو سچ مچ سبھی کو بھول گیا  
آخری بت خدا نہ کیوں ٹھہرے  
بت شکن بت گری کو بھول گیا  
اب تو ہر بات یاد رہتی ہے  
غالباً میں کسی کو بھول گیا  
اس کی خوشیوں سے جانے والا جون  
اپنی ایذا دہی کو بھول گیا  
کس سے اظہار مدعا کیجے  
آپ ملتے نہیں ہیں کیا کیجے  
ہو نہ پایا یہ فیصلہ اب تک  
آپ کیجے تو کیا کیا کیجے  
آپ تھے جس کے چارہ گر وہ جواں  
سخت بیمار ہے دعا کیجے  
ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے  
جس سے ملیے اسے خفا کیجے  
ہے تقاضا مری طبیعت کا  
ہر کسی کو چراغ پا کیجے  
ہے تو بارے یہ عالم اسباب  
ہے سبب چیلنے لگا کیجے  
آج ہم کیا گلہ کریں اس سے  
گلہ تنگی قبا کیجے  
نطق حیوان پر گراں ہے ابھی  
گفتگو کم سے کم کیا کیجے



حضرت زلف غالبہ افشاں  
 نام اپنا صبا صبا کیجے  
 زندگی کا عجب معاملہ ہے  
 ایک لمحے میں فیصلہ کیجے  
 مجھ کو عادت ہے روٹھ جانے کی  
 آپ مجھ کو منا لیا کیجے  
 ملتے رہیے اسی تپاک کے ساتھ  
 بے وفائی کی انتہا کیجے  
 کوہ کن کو بے خودکشی خواہش  
 شاہ بانو سے التجا کیجے  
 مجھ سے کہتی تھیں وہ شراب آنکھیں  
 آپ وہ زہر مت پیا کیجے  
 رنگ بر رنگ میں بے داد طلب  
 خون تھوکوں تو واہ وا کیجے  
 تو بھی چپ ہے میں بھی چپ ہوں یہ کیسی تنہائی ہے  
 تیرے ساتھ تری یاد آئی کیا تو سچ مچ آئی ہے  
 شاید وہ دن پہلا دن تھا پلکیں بوجھل ہونے کا  
 مجھ کو دیکھتے ہی جب اس کی انگڑائی شرمائی ہے  
 اس دن پہلی بار ہوا تھا مجھ کو رفاقت کا احساس  
 جب اس کے ملبوس کی خوشبو گھر پہنچانے آئی ہے  
 حسن سے عرض شوق نہ کرنا حسن کو زک پہنچانا ہے  
 ہم نے عرض شوق نہ کر کے حسن کو زک پہنچائی ہے  
 ہم کو اور تو کچھ نہیں سوچا البتہ اس کے دل میں  
 سوز رقابت پیدا کر کے اس کی نیند اڑائی ہے  
 ہم دونوں مل کر بھی دلوں کی تنہائی میں بھٹکیں گے  
 پاگل کچھ تو سوچ یہ تو نے کیسی شکل بنائی ہے  
 عشق پیچاں کی صندل پر جانے کس دن بیل چڑھے  
 کیاری میں پانی ٹھہرا ہے دیواروں پر کائی ہے  
 حسن کے جانے کتنے چہرے حسن کے جانے کتنے نام  
 عشق کا پیشہ حسن پرستی عشق بڑا برجائی ہے  
 آج بہت دن بعد میں اپنے کمرے تک آنکلا تھا  
 جوں ہی دروازہ کھولا ہے اس کی خوشبو آئی ہے  
 ایک تو اتنا حبس ہے پھر میں سانسیں روکے بیٹھا ہوں  
 ویرانی نے جھاڑو دے کے گھر میں دھول اڑائی ہے  
 ایذا دہی کی داد جو پاتا رہا ہوں میں  
 ہر ناز آفریں کو ستاتا رہا ہوں میں  
 اے خوش خرام پاؤں کے چھالے تو گن ذرا  
 تجھ کو کہاں کہاں نہ پھراتا رہا ہوں میں  
 اک حسن بے مثال کی تمثیل کے لیے  
 پرچھائیوں پہ رنگ گراتا رہا ہوں میں  
 کیا مل گیا ضمیر ہنر بیچ کر مجھے  
 اتنا کہ صرف کام چلاتا رہا ہوں میں  
 روحوں کے پردہ پوش گناہوں سے بے خبر  
 جسموں کی نیکیاں ہی گناتا رہا ہوں میں  
 تجھ کو خبر نہیں کہ ترا کرب دیکھ کر  
 اکثر ترا مذاق اڑاتا رہا ہوں میں  
 شاید مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی  
 لیکن یقین سب کو دلاتا رہا ہوں میں  
 اک سطر بھی کبھی نہ لکھی میں نے تیرے نام  
 پاگل تجھی کو یاد بھی آتا رہا ہوں میں

جس دن سے اعتماد میں آیا ترا شباب  
اس دن سے تجھ پہ ظلم ہی ڈھاتا رہا ہوں میں  
اپنا مثالیہ مجھے اب تک نہ مل سکا  
ذروں کو آفتاب بناتا رہا ہوں میں  
بیدار کر کے تیرے بدن کی خود آگہی  
تیرے بدن کی عمر گھٹاتا رہا ہوں میں  
کل دوپہر عجیب سی اک بے دلی رہی  
بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں میں  
آخری بار آہ کر لی ہے  
میں نے خود سے نباہ کر لی ہے  
اپنے سر اک بلا تو لینی تھی  
میں نے وہ زلف اپنے سر لی ہے  
دن بھلا کس طرح گزارو گے  
وصل کی شب بھی اب گزر لی ہے  
جاں نثاروں پہ وار کیا کرنا  
میں نے بس باتھ میں سپر لی ہے  
جو بھی مانگو ادھار دوں گا میں  
اس گلی میں دکان کر لی ہے  
میرا کشکول کب سے خالی تھا  
میں نے اس میں شراب بھر لی ہے  
اور تو کچھ نہیں کیا میں نے  
اپنی حالت تباہ کر لی ہے  
شیخ آیا تھا محتسب کو لیے  
میں نے بھی ان کی وہ خبر لی ہے  
اپنا خاکم لگتا ہوں  
ایک تماشا لگتا ہوں  
آئینوں کو زنگ لگا  
اب میں کیسا لگتا ہوں  
اب میں کوئی شخص نہیں  
اس کا سایا لگتا ہوں  
سارے رشتے تشنہ ہیں  
کیا میں دریا لگتا ہوں  
اس سے گلے مل کر خود کو  
تتہا تتہا لگتا ہوں  
خود کو میں سب آنکھوں میں  
دھندلا دھندلا لگتا ہوں  
میں ہر لمحہ اس گھر سے  
جانے والا لگتا ہوں  
کیا ہوئے وہ سب لوگ کہ میں  
سونا سونا لگتا ہوں  
مصلحت اس میں کیا ہے میری  
ٹوٹا پھوٹا لگتا ہوں  
کیا تم کو اس حال میں بھی  
میں دنیا کا لگتا ہوں  
کب کا روگی ہوں ویسے  
شہر مسیحا لگتا ہوں  
میرا تالو تر کر دو  
سچ مچ پیاسا لگتا ہوں  
مجھ سے کما لو کچھ پیسے  
زندہ مردہ لگتا ہوں

میں نے سہے ہیں مگر اپنے  
اب بیچارہ لگتا ہوں  
ہم تو جیسے وہاں کے تھے ہی نہیں  
ہے اماں تھے اماں کے تھے ہی نہیں  
ہم کہ ہیں تیری داستاں یکسر  
ہم تری داستاں کے تھے ہی نہیں  
ان کو اندھی میں ہی بکھرنا تھا  
بال و پر آشیاں کے تھے ہی نہیں  
اب ہمارا مکان کس کا ہے  
ہم تو اپنے مکان کے تھے ہی نہیں  
ہو تری خاک آستاں پہ سلام  
ہم ترے آستاں کے تھے ہی نہیں  
ہم نے رنجش میں یہ نہیں سوچا  
کچھ سخن تو زباں کے تھے ہی نہیں  
دل نے ڈالا تھا درمیاں جن کو  
لوگ وہ درمیاں کے تھے ہی نہیں  
اس گلی نے یہ سن کے صبر کیا  
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں  
کام کی بات میں نے کی ہی نہیں  
یہ مرا طور زندگی ہی نہیں  
اے امید اے امید نو میداں  
مجھ سے میت تری اٹھی ہی نہیں  
میں جو تھا اس گلی کا مست خرام  
اس گلی میں مری چلی ہی نہیں  
یہ سنا ہے کہ میرے کوچ کے بعد  
اس کی خوشبو کہیں بسی ہی نہیں  
تھی جو اک فاختہ اداس اداس  
صبح وہ شاخ سے اڑی ہی نہیں  
مجھ میں اب میرا جی نہیں لگتا  
اور ستم یہ کہ میرا جی ہی نہیں  
وہ جو رہتی تھی دل محلے میں  
پھر وہ لڑکی مجھے ملی ہی نہیں  
جانے اور خاک اڑانے آپ  
اب وہ گھر کیا کہ وہ گلی ہی نہیں  
ہائے وہ شوق جو نہیں تھا کبھی  
ہائے وہ زندگی جو تھی ہی نہیں  
آپ اپنا غبار تھے ہم تو  
یاد تھے یادگار تھے ہم تو  
پردگی ہم سے کیوں رکھا پردہ  
تیرے ہی پردہ دار تھے ہم تو  
وقت کی دھوپ میں تمہارے لیے  
شجر سایہ دار تھے ہم تو  
اڑے جاتے ہیں دھول کے مانند  
اندھیوں پر سوار تھے ہم تو  
ہم نے کیوں خود پہ اعتبار کیا  
سخت ہے اعتبار تھے ہم تو  
شرم ہے اپنی بار باری کی  
ہے سبب بار بار تھے ہم تو  
کیوں ہمیں کر دیا گیا مجبور  
خود ہی ہے اختیار تھے ہم تو

تم نے کیسے بھلا دیا ہم کو  
تم سے ہی مستعار تھے ہم تو  
خوش نہ آیا ہمیں جیسے جانا  
لمحے لمحے پہ بار تھے ہم تو  
سہم بھی لیتے ہمارے طعنوں کو  
جان من جاں نثار تھے ہم تو  
خود کو دوران حال میں اپنے  
بے طرح ناگوار تھے ہم تو  
تم نے ہم کو بھی کر دیا برباد  
نادر روزگار تھے ہم تو  
ہم کو یاروں نے یاد بھی نہ رکھا  
جون یاروں کے یار تھے ہم تو  
جی ہی جی میں وہ جل رہی ہوگی  
چاندنی میں ٹہل رہی ہوگی  
چاند نے تان لی بے چادر ابر  
اب وہ کپڑے بدل رہی ہوگی  
سو گئی ہوگی وہ شفق اندام  
سبز قندیل جل رہی ہوگی  
سرخ اور سبز وادیوں کی طرف  
وہ مرے ساتھ چل رہی ہوگی  
چڑھتے چڑھتے کسی پہاڑی پر  
اب وہ کروٹ بدل رہی ہوگی  
پیڑ کی چھال سے رگڑ کھا کر  
وہ تپے سے پھسل رہی ہوگی  
نیلگوں جھیل ناف تک پہنچے  
صندلیں جسم مل رہی ہوگی  
بو کے وہ خواب عیش سے بیدار  
کتنی ہی دیر شل رہی ہوگی  
چلو باد بہاری جا رہی ہے  
پیا جی کی سواری جا رہی ہے  
شمال جاودان سبز جاں سے  
تمنا کی عمارت جا رہی ہے  
فغاں اے دشمن دار دل و جاں  
مری حالت سدھاری جا رہی ہے  
بے پہلو میں ٹکے کی اک حسینہ  
تری فرقت گزاری جا رہی ہے  
جو ان روزوں مرا غم ہے وہ یہ ہے  
کہ غم سے بردباری جا رہی ہے  
بے سینے میں عجب اک حشر برپا  
کہ دل سے بے قراری جا رہی ہے  
میں پیہم بار کر یہ سوچتا ہوں  
وہ کیا شے ہے جو باری جا رہی ہے  
دل اس کے رو بہ رو ہے اور گم صم  
کوئی عرضی گزاری جا رہی ہے  
وہ سید بچہ ہو اور شیخ کے ساتھ  
میاں عزت ہماری جا رہی ہے  
بے برپا ہر گلی میں شور و غم  
مری فریاد ماری جا رہی ہے  
وہ یاد اب ہو رہی ہے دل سے رخصت  
میاں پیاروں کی پیاری جا رہی ہے

دریغا تیری نزدیکی میاں جان  
تری دوری پہ واری جا رہی ہے  
بہت بد حال ہیں بستی ترے لوگ  
تو پھر تو کیوں سنواری جا رہی ہے  
تری مریم نگاہی اے مسیحا  
خراش دل پہ واری جا رہی ہے  
خراے میں عجب تھا شور برپا  
دلوں سے انتظاری جا رہی ہے  
دل جو ہے آگ لگا دوں اس کو  
اور پھر خود ہی ہوا دوں اس کو  
جو بھی ہے اس کو گنوا بیٹھا ہے  
میں بھلا کیسے گنوا دوں اس کو  
تجھ گماں پر جو عمارت کی تھی  
سوچتا ہوں کہ میں ڈھا دوں اس کو  
جسم میں آگ لگا دوں اس کے  
اور پھر خود ہی بجھا دوں اس کو  
بجر کی نذر تو دینی ہے اسے  
سوچتا ہوں کہ بھلا دوں اس کو  
جو نہیں ہے مرے دل کی دنیا  
کیوں نہ میں جوئے مٹا دوں اس کو  
اس کے پہلو سے لگ کے چلتے ہیں  
ہم کہیں ٹالنے سے ٹلتے ہیں  
بند ہے مے کدوں کے دروازے  
ہم تو بس یوں ہی چل نکلتے ہیں  
میں اسی طرح تو بہلتا ہوں  
اور سب جس طرح بہلتے ہیں  
وہ ہے جان اب ہر ایک محفل کی  
ہم بھی اب گھر سے کم نکلتے ہیں  
کیا تکلف کریں یہ کہنے میں  
جو بھی خوش ہے ہم اس سے جلتے ہیں  
ہے اسے دور کا سفر در پیش  
ہم سنبھالے نہیں سنبھلتے ہیں  
شام فرقت کی لہلہا اٹھی  
وہ ہوا ہے کہ زخم بھرتے ہیں  
ہے عجب فیصلے کا صحرا بھی  
چل نہ پڑے تو پاؤں جلتے ہیں  
ہو رہا ہوں میں کس طرح برباد  
دیکھنے والے ہاتھ ملتے ہیں  
تم بنو رنگ تم بنو خوشبو  
ہم تو اپنے سخن میں ڈھلتے ہیں  
شرمندگی ہے ہم کو بہت ہم ملے تمہیں  
تم سر ہم سر خوشی تھے مگر غم ملے تمہیں  
میں اپنے آپ میں نہ ملا اس کا غم نہیں  
غم تو یہ ہے کہ تم بھی بہت کم ملے تمہیں  
ہے جو ہمارا ایک حساب اس حساب سے  
اُٹی ہے ہم کو شرم کہ پیہم ملے تمہیں  
تم کو جہان شوق و تمنا میں کیا ملا  
ہم بھی ملے تو درہم و برہم ملے تمہیں  
اب اپنے طور ہی میں نہیں تم سو کاش کہ  
خود میں خود اپنا طور کوئی دم ملے تمہیں

اس شہر حیلہ جو میں جو محرم ملے مجھے  
 فریاد جان جاں وہی محرم ملے تمہیں  
 دیتا ہوں تم کو خشک مڑگاں کی میں دعا  
 مطلب یہ ہے کہ دامن پر نہ ملے تمہیں  
 میں ان میں آج تک کبھی پایا نہیں گیا  
 جاناں جو میرے شوق کے عالم ملے تمہیں  
 تم نے ہمارے دل میں بہت دن سفر کیا  
 شرمندہ ہیں کہ اس میں بہت خم ملے تمہیں  
 یوں ہو کہ اور ہی کوئی حوا ملے مجھے  
 ہو یوں کہ اور ہی کوئی آدم ملے تمہیں  
 گھر سے ہم گھر تلک گئے ہوں گے  
 اپنے ہی آپ تک گئے ہوں گے  
 ہم جو اب آدمی ہیں پہلے کبھی  
 جام ہوں گے چھلک گئے ہوں گے  
 وہ بھی اب ہم سے تھک گیا ہوگا  
 ہم بھی اب اس سے تھک گئے ہوں گے  
 شب جو ہم سے ہوا معاف کرو  
 نہیں پی تھی بہک گئے ہوں گے  
 کتنے ہی لوگ حرص شہرت میں  
 دار پر خود لٹک گئے ہوں گے  
 شکر ہے اس نگاہ کم کا میاں  
 پہلے ہی ہم کھٹک گئے ہوں گے  
 ہم تو اپنی تلاش میں اکثر  
 از سما تا سمک گئے ہوں گے  
 اس کا لشکر جہاں تھاں یعنی  
 ہم بھی بس بے کمک گئے ہوں گے  
 جوۓ اللہ اور یہ عالم  
 بیچ میں ہم اٹک گئے ہوں گے  
 ہر دھڑکن بیجانی تھی ہر خاموشی طوفانی تھی  
 پھر بھی محبت صرف مسلسل ملنے کی آسانی تھی  
 جس دن اس سے بات ہوئی تھی اس دن بھی بے کیف تھا میں  
 جس دن اس کا خط آیا ہے اس دن بھی ویرانی تھی  
 جب اس نے مجھ سے یہ کہا تھا عشق رفاقت ہی تو نہیں  
 تب میں نے ہر شخص کی صورت مشکل سے پہچانی تھی  
 جس دن وہ ملنے آئی ہے اس دن کی روداد یہ ہے  
 اس کا بلاؤز نارنجی تھا اس کی ساری دھانی تھی  
 الجھن سی ہونے لگتی تھی مجھ کو اکثر اور وہ یوں  
 میرا مزاج عشق تھا شہری اس کی وفا دہانی تھی  
 اب تو اس کے بارے میں تم جو چاہو وہ کہہ ڈالو  
 وہ انگڑانی میرے کمرے تک تو بڑی روحانی تھی  
 نام پہ ہم قربان تھے اس کے لیکن پھر یہ طور ہوا  
 اس کو دیکھ کے رک جانا بھی سب سے بڑی قربانی تھی  
 مجھ سے بچھڑ کر بھی وہ لڑکی کتنی خوش خوش رہتی ہے  
 اس لڑکی نے مجھ سے بچھڑ کر مر جانے کی ٹھانی تھی  
 عشق کی حالت کچھ بھی نہیں تھی بات بڑھانے کا فن تھا  
 لمحے لا فانی ٹھہرے تھے قطروں کی طغیانی تھی  
 جس کو خود میں نے بھی اپنی روح کا عرفاں سمجھا تھا  
 وہ تو شاید میرے پیاسے بوٹوں کی شیطانی تھی  
 تھا دربار کلاں بھی اس کا نوبت خانہ اس کا تھا  
 تھی میرے دل کی جو رانی امروہے کی رانی تھی

اب وہ گھر اک ویرانہ تھا بس ویرانہ زندہ تھا  
 سب آنکھیں دم توڑ چکی تھیں اور میں تنہا زندہ تھا  
 ساری گلی سنسان پڑی تھی باد فنا کے پہرے میں  
 بجر کے دالان اور آنگن میں بس اک سایہ زندہ تھا  
 وہ جو کبوتر اس موکھے میں رہتے تھے کس دیس اڑے  
 ایک کا نام نوازندہ تھا اور اک کا بازندہ تھا  
 وہ دوپہر اپنی رخصت کی ایسا ویسا دھوکا تھی  
 اپنے اندر اپنی لاش اٹھائے میں جھوٹا زندہ تھا  
 تھیں وہ گھر راتیں بھی کہانی وعدے اور پھر دن گننا  
 آنا تھا جانے والے کو جانے والا زندہ تھا  
 دستک دینے والے بھی تھے دستک سننے والے بھی  
 تھا آباد محلہ سارا ہر دروازہ زندہ تھا  
 پیلے پتوں کو سم پہر کی وحشت پرسا دیتی تھی  
 آنگن میں اک اوندھے گھڑے پر بس اک کوا زندہ تھا  
 دل نے وفا کے نام پر کار وفا نہیں کیا  
 خود کو ہلاک کر لیا خود کو فدا نہیں کیا  
 خیرہ سران شوق کا کوئی نہیں ہے جنبہ دار  
 شہر میں اس گروہ نے کس کو خفا نہیں کیا  
 جو بھی ہو تم پہ معترض اس کو یہی جواب دو  
 آپ بہت شریف ہیں آپ نے کیا نہیں کیا  
 نسبت علم ہے بہت حاکم وقت کو عزیز  
 اس نے تو کار جہل بھی ہے علما نہیں کیا  
 جس کو بھی شیخ و شاہ نے حکم خدا دیا قرار  
 ہم نے نہیں کیا وہ کام ہاں ہم خدا نہیں کیا  
 زندگی کیا ہے اک کہانی ہے  
 یہ کہانی نہیں سنائی ہے  
 ہے خدا بھی عجیب یعنی جو  
 نہ زمینی نہ آسمانی ہے  
 ہے مرے شوق وصل کو یہ گلہ  
 اس کا پہلو سرائے فانی ہے  
 اپنی تعمیر جان و دل کے لیے  
 اپنی بنیاد ہم کو ڈھانی ہے  
 یہ ہے لمحوں کا ایک شہر ازل  
 یاں کی ہر بات ناگہانی ہے  
 چلیے اے جان شام آج تمہیں  
 شمع اک قبر پر جلانی ہے  
 رنگ کی اپنی بات ہے ورنہ  
 آخرش خون بھی تو پانی ہے  
 اک عبث کا وجود ہے جس سے  
 زندگی کو مراد پانی ہے  
 شام ہے اور صحن میں دل کے  
 اک عجب حزن آسمانی ہے  
 ہم جی رہے ہیں کوئی بہانہ کیے بغیر  
 اس کے بغیر اس کی تمنا کئے بغیر  
 انبار اس کا پردہ حرمت بنا میاں  
 دیوار تک نہیں گری پردا کیے بغیر  
 یاراں وہ جو ہے میرا مسیحا ہے جان و دل  
 ہے حد عزیز ہے مجھے اچھا کیے بغیر  
 میں بستر خیال پہ لیٹا ہوں اس کے پاس  
 صبح ازل سے کوئی تقاضا کیے بغیر

اس کا ہے جو بھی کچھ ہے مرا اور میں مگر  
 وہ مجھ کو چاہئے کوئی سودا کیے بغیر  
 یہ زندگی جو ہے اسے معنیٰ بھی چاہیے  
 وعدہ ہمیں قبول ہے ایفا کیے بغیر  
 اے قاتلوں کے شہر بس اتنی ہی عرض ہے  
 میں ہوں نہ قتل کوئی تماشا کیے بغیر  
 مرشد کے جھوٹ کی تو سزا ہے حساب ہے  
 تم چھوڑیو نہ شہر کو صحرا کیے بغیر  
 ان آنکھوں میں کتنا سکون و سرور تھا  
 آرائش نظر تری پروا کیے بغیر  
 یاراں خوشا یہ روز و شب دل کم اب ہمیں  
 سب کچھ ہے خوش گوار گوارا کیے بغیر  
 گریہ کناں کی فرد میں اپنا نہیں ہے نام  
 ہم گریہ کن ازل کے ہیں گریہ کیے بغیر  
 آخر ہیں کون لوگ جو بخشے ہی جائیں گے  
 تاریخ کے حرام سے توبہ کیے بغیر  
 وہ سنی بچہ کون تھا جس کی جفا نے جون  
 شیعہ بنا دیا ہمیں شیعہ کیے بغیر  
 اب تم کبھی نہ اؤ گے یعنی کبھی کبھی  
 رخصت کرو مجھے کوئی وعدہ کیے بغیر  
 روح پیاسی کہاں سے آتی ہے  
 یہ اداسی کہاں سے آتی ہے  
 ہے وہ یک سر سپردگی تو بھلا  
 بد حواسی کہاں سے آتی ہے  
 وہ ہم آغوش ہے تو پھر دل میں  
 نا شناسی کہاں سے آتی ہے  
 ایک زندان ہے دلی اور شام  
 یہ صبا سی کہاں سے آتی ہے  
 تو ہے پہلو میں پھر تری خوشبو  
 بو کے باسی کہاں سے آتی ہے  
 دل ہے شب سوختہ سواے امید  
 تو ندا سی کہاں سے آتی ہے  
 میں ہوں تجھ میں اور آس ہوں تیری  
 تو نراسی کہاں سے آتی ہے  
 دل کی تکلیف کم نہیں کرتے  
 اب کوئی شکوہ ہم نہیں کرتے  
 جان جاں تجھ کو اب تری خاطر  
 یاد ہم کوئی دم نہیں کرتے  
 دوسری بار کی ہوس ہے سو ہم  
 سر تسلیم خم نہیں کرتے  
 وہ بھی پڑھتا نہیں ہے اب دل سے  
 ہم بھی نالے کو ہم نہیں کرتے  
 جرم میں ہم کمی کریں بھی تو کیوں  
 تم سزا بھی تو کم نہیں کرتے  
 اب کسی سے مرا حساب نہیں  
 میری آنکھوں میں کوئی خواب نہیں  
 خون کے گھونٹ پی رہا ہوں میں  
 یہ مرا خون ہے شراب نہیں  
 میں شرابی ہوں میری اس نہ چھین  
 تو مری اس ہے سراب نہیں



نوچ پھینکے لبوں سے میں نے سوال  
 طاقت شوخی جواب نہیں  
 اب تو پنجاب بھی نہیں پنجاب  
 اور خود جیسا اب دو اب نہیں  
 غم ابد کا نہیں ہے اُن کا ہے  
 اور اس کا کوئی حساب نہیں  
 بودش اک رو ہے ایک رو یعنی  
 اس کی فطرت میں انقلاب نہیں  
 آج لب گہر فشاں آپ نے وا نہیں کیا  
 تذکرہ خجستہ آب و ہوا نہیں کیا  
 کیسے کہیں کہ تجھ کو بھی ہم سے ہے واسطہ کوئی  
 تو نے تو ہم سے آج تک کوئی گلہ نہیں کیا  
 جانے تری نہیں کے ساتھ کتنے ہی جبر تھے کہ تھے  
 میں نے ترے لحاظ میں تیرا کہا نہیں کیا  
 مجھ کو یہ ہوش ہی نہ تھا تو مرے بازوؤں میں ہے  
 یعنی تجھے ابھی تلک میں نے رہا نہیں کیا  
 تو بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہو غالباً  
 میں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا  
 ہاں وہ نگاہ ناز بھی اب نہیں ماجرا طلب  
 ہم نے بھی اب کی فصل میں شور بپا نہیں کیا  
 جو ہوا جو وہ ہوا بھی نہیں  
 یعنی جو کچھ بھی تھا وہ تھا بھی نہیں  
 بس گیا جب وہ شہر دل میں مرے  
 پھر میں اس شہر میں رہا بھی نہیں  
 اک عجب طور حال ہے کہ جو ہے  
 یعنی میں بھی نہیں خدا بھی نہیں  
 لمحوں سے اب معاملہ کیا ہو  
 دل پہ اب کچھ گزر رہا بھی نہیں  
 جانے میں چلا گیا ہوں کہاں  
 میں تو خود سے کہیں گیا بھی نہیں  
 تو مرے دل میں اُن کے بس جا  
 اور تو میرے پاس ابھی نہیں  
 تنگ آغوش میں آباد کروں گا تجھ کو  
 ہوں بہت شاد کہ ناشاد کروں گا تجھ کو  
 فکر ایجاد میں گم ہوں مجھے غافل نہ سمجھ  
 اپنے انداز پر ایجاد کروں گا تجھ کو  
 نشہ ہے راہ کی دوری کا کہ ہم راہ ہے تو  
 جانے کس شہر میں آباد کروں گا تجھ کو  
 میری بانہوں میں بہکنے کی سزا بھی سن لے  
 اب بہت دیر میں آزاد کروں گا تجھ کو  
 میں کہ رہتا ہوں بصد ناز گریزاں تجھ سے  
 تو نہ ہوگا تو بہت یاد کروں گا تجھ کو  
 سارے رشتے تباہ کر آیا  
 دل برباد اپنے گھر آیا  
 آخرش خون تھوکنے سے میاں  
 بات میں تیری کیا اثر آیا  
 تھا خبر میں زیاں دل و جاں کا  
 ہر طرف سے میں نے خبر آیا  
 اب یہاں ہوش میں کبھی اپنے  
 نہیں اؤں گا میں اگر آیا

میں رہا عمر بھر جدا خود سے  
یاد میں خود کو عمر بھر آیا  
وہ جو دل نام کا تھا ایک نفر  
آج میں اس سے بھی مکر آیا  
مدتوں بعد گھر گیا تھا میں  
جاتے ہی میں وہاں سے ڈر آیا  
جز گماں اور تھا ہی کیا میرا  
فقط اک میرا نام تھا میرا  
نکبت پیرین سے اس گل کی  
سلسلہ بے صبا رہا میرا  
مجھ کو خوابش ہی ڈھونڈنے کی نہ تھی  
مجھ میں کھویا رہا خدا میرا  
تھوک دے خون جان لے وہ اگر  
عالم ترک مدعا میرا  
جب تجھے میری چاہ تھی جاناں  
بس وہی وقت تھا کڑا میرا  
کوئی مجھ تک پہنچ نہیں پاتا  
اتنا آسان بے پتا میرا  
آچکا پیش وہ مروت سے  
اب چلوں کام ہو چکا میرا  
آج میں خود سے ہو گیا مایوس  
آج اک یار مر گیا میرا  
وہ جو تھا وہ کبھی ملا ہی نہیں  
سو گریباں کبھی سلا ہی نہیں  
اس سے ہر دم معاملہ بے مگر  
درمیاں کوئی سلسلہ ہی نہیں  
بے ملے ہی بچھڑ گئے ہم تو  
سو گلے ہیں کوئی گلہ ہی نہیں  
چشم میگوں سے بے مفاں نے کہا  
مست کر دے مگر پلا ہی نہیں  
تو جو بے جان تو جو بے جاناں  
تو ہمیں آج تک ملا ہی نہیں  
مست ہوں میں مہک سے اس گل کی  
جو کسی باغ میں کھلا ہی نہیں  
ہائے جو اس کا وہ پیالہ ناف  
جام ایسا کوئی ملا ہی نہیں  
تو بے اک عمر سے فغاں پیشہ  
ابھی سینہ ترا چھلا ہی نہیں  
ابھی فرمان آیا بے وہاں سے  
کہ ہٹ جاؤں میں اپنے درمیاں سے  
یہاں جو بے تنفس ہی میں گم بے  
پرندے اڑ رہے ہیں شاخ جاں سے  
دریچہ باز بے یادوں کا اور میں  
ہوا سنتا ہوں پیڑوں کی زباں سے  
زمانہ تھا وہ دل کی زندگی کا  
تری فرقت کے دن لاؤں کہاں سے  
تھا اب تک معرکہ بابر کا درپیش  
ابھی تو گھر بھی جانا بے یہاں سے  
فلاں سے تھی غزل بہتر فلاں کی  
فلاں کے زخم اچھے تھے فلاں سے

خبر کیا دوں میں شہر رفتگاں کی  
کوئی لوٹے بھی شہر رفتگاں سے  
یہی انجام کیا تجھ کو ہوس تھا  
کوئی پوچھے تو میر داستان سے  
عیش امید ہی سے خطرہ ہے  
دل کو اب دل دہی سے خطرہ ہے  
بے کچھ ایسا کہ اس کی جلوت میں  
ہمیں اپنی کمی سے خطرہ ہے  
جس کے آغوش کا ہوں دیوانہ  
اس کے آغوش ہی سے خطرہ ہے  
یاد کی دھوپ تو ہے روز کی بات  
ہاں مجھے چاندنی سے خطرہ ہے  
بے عجب کچھ معاملہ درپیش  
عقل کو آگہی سے خطرہ ہے  
شہر غدار جان لے کہ تجھے  
ایک امروہی سے خطرہ ہے  
بے عجب طور حالت گریہ  
کہ مڑہ کو نمی سے خطرہ ہے  
حال خوش لکھنؤ کا دلی کا  
بس انہیں مصحفی سے خطرہ ہے  
آسمانوں میں ہے خدا تنہا  
اور ہر آدمی سے خطرہ ہے  
میں کہوں کس طرح یہ بات اس سے  
تجھ کو جانم مجھی سے خطرہ ہے  
آج بھی اے کنار بان مجھے  
تیری اک سانولی سے خطرہ ہے  
ان لبوں کا لہو نہ پی جاؤں  
اپنی تشنہ لبی سے خطرہ ہے  
جون ہی تو ہے جون کے دریئے  
میر کو میر ہی سے خطرہ ہے  
اب نہیں کوئی بات خطرے کی  
اب سبھی کو سبھی سے خطرہ ہے  
اے صبح میں اب کہاں رہا ہوں  
خوابوں ہی میں صرف ہو چکا ہوں  
سب میرے بغیر مطمئن ہوں  
میں سب کے بغیر جی رہا ہوں  
کیا ہے جو بدل گئی ہے دنیا  
میں بھی تو بہت بدل گیا ہوں  
گو اپنے بزار نام رکھ لوں  
پر اپنے سوا میں اور کیا ہوں  
میں جرم کا اعتراف کر کے  
کچھ اور ہے جو چھپا گیا ہوں  
میں اور فقط اسی کی خواہش  
اخلاق میں جھوٹ بولتا ہوں  
اک شخص جو مجھ سے وقت لے کر  
آج نہ سکا تو خوش ہوا ہوں  
ہر شخص سے ہے نیاز ہو جا  
پھر سب سے یہ کہہ کہ میں خدا ہوں  
چرکے تو تجھے دے ہیں میں نے  
پر خون بھی میں ہی تھوکتا ہوں

رویا ہوں تو اپنے دوستوں میں  
پر تجھ سے تو ہنس کے ہی ملا ہوں  
اے شخص میں تیری جستجو سے  
بیزار نہیں ہوں تھک گیا ہوں  
میں شمع سحر کا نغمہ گر تھا  
اب تھک کے کراہنے لگا ہوں  
کل پر ہی رکھو وفا کی باتیں  
میں آج بہت بوجھا ہوا ہوں  
کوئی بھی نہیں ہے مجھ سے ناام  
بس طے یہ ہوا کہ میں برا ہوں  
خوب ہے شوق کا یہ پہلو بھی  
میں بھی برباد ہو گیا تو بھی  
حسن مغموم تمکنت میں تری  
فرق آیا نہ یک سر مو بھی  
یہ نہ سوچا تھا زیر سایہ زلف  
کہ بچھڑ جائے گی یہ خوش بو بھی  
حسن کہتا تھا چھیڑنے والے  
چھیڑنا ہی تو بس نہیں چھو بھی  
ہائے وہ اس کا موج خیز بدن  
میں تو پیاسا رہا لب جو بھی  
یاد آتے ہیں معجزے اپنے  
اور اس کے بدن کا جادو بھی  
یاسمین اس کی خاص محرم راز  
یاد آیا کرے گی اب تو بھی  
یاد سے اس کی بے مرا پر بیز  
اے صبا اب نہ آئی تو بھی  
ہیں یہی جونِ ایلیا جو کبھی  
سخت مغرور بھی تھے بد خو بھی  
زخم امید بھر گیا کب کا  
قیس تو اپنے گھر گیا کب کا  
اب تو منہ اپنا مت دکھاؤ مجھے  
ناصر میں سدھر گیا کب کا  
آپ اب پوچھنے کو آئے ہیں  
دل مری جان مر گیا کب کا  
آپ اک اور نیند لے لیجے  
قافلہ کوچ کر گیا کب کا  
میرا فہرست سے نکال دو نام  
میں تو خود سے مکر گیا کب کا  
بے عجب حال یہ زمانے کا  
یاد بھی طور بے بھلانے کا  
پسند آیا بہت ہمیں پیشہ  
خود ہی اپنے گھروں کو ڈھانے کا  
کاش ہم کو بھی ہو نصیب کبھی  
عیش دفتر میں گنگنانے کا  
آسمان بے خموشی جاوید  
میں بھی اب لب نہیں بلانے کا  
جان کیا اب ترا پیالہ ناف  
نشہ مجھ کو نہیں پلانے کا  
شوق ہے اس دل درندہ کو  
آپ کے ہونٹ کاٹ کھانے کا

اتنا نادم ہوا ہوں خود سے کہ میں  
 اب نہیں خود کو آزمانے کا  
 کیا کہوں جان کو بچانے میں  
 جو خطرہ ہے جان جانے کا  
 یہ جہاں جو اک جہنم ہے  
 یاں خدا بھی نہیں ہے آنے کا  
 زندگی ایک فن ہے لمحوں کو  
 اپنے انداز سے گنوانے کا  
 ہم آندھیوں کے بن میں کسی کارواں کے تھے  
 جانے کہاں سے آنے ہیں جانے کہاں کے تھے  
 اے جان داستان تجھے آیا کبھی خیال  
 وہ لوگ کیا ہوئے جو تری داستان کے تھے  
 ہم تیرے آستان پہ یہ کہنے کو آنے ہیں  
 وہ خاک ہو گئے جو ترے آستان کے تھے  
 مل کر تپاک سے نہ ہمیں کیجیے اداس  
 خاطر نہ کیجیے کبھی ہم بھی یہاں کے تھے  
 کیا پوچھتے ہو نام و نشان مسافراں  
 بندوستان میں آنے ہیں بندوستان کے تھے  
 اب خاک اڑ رہی ہے یہاں انتظار کی  
 اے دل یہ بام و در کسی جان جہاں کے تھے  
 ہم کس کو دیں بھلا در و دیوار کا حساب  
 یہ ہم جو ہیں زمیں کے نہ تھے آسمان کے تھے  
 ہم سے چھنا ہے ناف پیالہ ترا میاں  
 گویا ازل سے ہم صف لب تشنگاں کے تھے  
 ہم کو حقیقتوں نے کیا ہے خراب و خوار  
 ہم خواب خواب اور گمان گمان کے تھے  
 صد یاد یاد جو وہ ہنگام دل کہ جب  
 ہم ایک گام کے نہ تھے پر بفت خواں کے تھے  
 وہ رشتہ ہائے ذات جو برباد ہو گئے  
 میرے گمان کے تھے کہ تمہارے گمان کے تھے  
 لمحے لمحے کی نارسائی ہے  
 زندگی حالت جدائی ہے  
 مرد میدان ہوں اپنی ذات کا میں  
 میں نے سب سے شکست کھائی ہے  
 اک عجب حال ہے کہ اب اس کو  
 یاد کرنا بھی ہے وفائی ہے  
 اب یہ صورت ہے جان جاں کہ تجھے  
 بھولنے میں مری بھلائی ہے  
 خود کو بھولا ہوں اس کو بھولا ہوں  
 عمر بھر کی یہی کمائی ہے  
 میں ہنر مند رنگ ہوں میں نے  
 خون تھوکا ہے داد پائی ہے  
 جانے یہ تیرے وصل کے ہنگام  
 تیری فرقت کہاں سے آئی ہے  
 کبھی جب مدتوں کے بعد اس کا سامنا ہوگا  
 سوائے پاس آداب تکلف اور کیا ہوگا  
 یہاں وہ کون ہے جو انتخاب غم پہ قادر ہو  
 جو مل جائے وہی غم دوستوں کا مدعا ہوگا  
 نوید سر خوشی جب آئے گی اس وقت تک شاید  
 ہمیں زہر غم بستی گوارا ہو چکا ہوگا

صلیب وقت پر میں نے پکارا تھا محبت کو  
 مری آواز جس نے بھی سنی ہوگی بنسا ہوگا  
 ابھی اک شور ہائے و ہو سنا ہے ساریانوں نے  
 وہ پاگل قافلے کی ضد میں پیچھے رہ گیا ہوگا  
 ہمارے شوق کے آسودہ و خوش حال ہونے تک  
 تمہارے عارض و گیسو کا سودا ہو چکا ہوگا  
 نوائیں نکھتیں آسودہ چہرے دل نشیں رشتے  
 مگر اک شخص اس ماحول میں کیا سوچتا ہوگا  
 ہنسی آتی ہے مجھ کو مصلحت کے ان تقاضوں پر  
 کہ اب اک اجنبی بن کر اسے پہچاننا ہوگا  
 دلیلوں سے دوا کا کام لینا سخت مشکل ہے  
 مگر اس غم کی خاطر یہ ہنر بھی سیکھنا ہوگا  
 وہ منکر ہے تو پھر شاید ہر اک مکتوب شوق اس نے  
 سر انگشت حنائی سے خلاؤں میں لکھا ہوگا  
 بے نصف شب وہ دیوانہ ابھی تک گھر نہیں آیا  
 کسی سے چاندنی راتوں کا قصہ چھڑ گیا ہوگا  
 صبا شکوا ہے مجھ کو ان دریچوں سے دریچوں سے  
 دریچوں میں تو دیمک کے سوا اب اور کیا ہوگا  
 بجر کی آنکھوں سے آنکھیں تو ملاتے جائیے  
 بجر میں کرنا ہے کیا یہ تو بتاتے جائیے  
 بن کے خوشبو کی اداسی ربیے دل کے باغ میں  
 دور ہوتے جائیے نزدیک آتے جائیے  
 جاتے جاتے آپ اتنا کام تو کیجے مرا  
 یاد کا سارا سر و سامان جلانے جائیے  
 رہ گئی امید تو برباد ہو جاؤں گا میں  
 جائیے تو پھر مجھے سچ مچ بھلاتے جائیے  
 زندگی کی انجمن کا بس یہی دستور ہے  
 بڑھ کے ملیے اور مل کر دور جاتے جائیے  
 آخرش رشتہ تو ہم میں اک خوشی اک غم کا تھا  
 مسکراتے جائیے آنسو بہاتے جائیے  
 وہ گلی ہے اک شرابی چشم کافر کی گلی  
 اس گلی میں جائیے تو لڑکھڑاتے جائیے  
 آپ کو جب مجھ سے شکوا ہی نہیں کوئی تو پھر  
 آگ ہی دل میں لگانی ہے لگاتے جائیے  
 کوچ ہے خوابوں سے تعبیروں کی سمتوں میں تو پھر  
 جائیے پر دم بہ دم برباد جاتے جائیے  
 آپ کا مہمان ہوں میں آپ میرے میزبان  
 سو مجھے زہر مروت تو پلاتے جائیے  
 بے سر شب اور مرے گھر میں نہیں کوئی چراغ  
 آگ تو اس گھر میں جانانہ لگاتے جائیے  
 بے بکھرنے کو یہ محفل رنگ و بو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے  
 ہر طرف ہو رہی ہے یہی گفتگو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے  
 ہر متاع نفس نذر آہنگ کی ہم کو یاراں ہوس تھی بہت رنگ کی  
 گل زمیں سے ابلنے کو ہے اب لہو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے  
 اول شب کا مہتاب بھی جا چکا صحن مے خانہ سے اب افق میں کہیں  
 آخر شب بے خالی ہیں جام و سبو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے  
 کوئی حاصل نہ تھا آرزو کا مگر سانحہ یہ ہے اب آرزو بھی نہیں  
 وقت کی اس مسافت میں بے آرزو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے  
 کس قدر دور سے لوٹ کر آئے ہیں یوں کہو عمر برباد کر آئے ہیں  
 تھا سراب اپنا سرمایہ جستجو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے

اک جنوں تھا کہ آباد ہو شہر جاں اور آباد جب شہر جاں ہو گیا  
 ہیں یہ سرگوشیاں در بہ در کو بہ کو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے  
 دشت میں رقص شوق بہار اب کہاں باد پیمائی دیوانہ وار اب کہاں  
 بس گزرنے کو ہے موسم باؤ ہو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے  
 ہم ہیں رسوا کن دلی و لکھنؤ اپنی کیا زندگی اپنی کیا آبرو  
 میر دلی سے نکلے گئے لکھنؤ تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے  
 کسی سے عہد و پیمان کر نہ رہیو  
 تو اس بستی میں رہیو پر نہ رہیو  
 سفر کرنا ہے آخر دو پلک بیچ  
 سفر لمبا ہے بے بستر نہ رہیو  
 ہر اک حالت کے پیری ہیں یہ لمحے  
 کسی غم کے بھروسے پر نہ رہیو  
 سہولت سے گزر جاؤ مری جاں  
 کہیں جینے کی خاطر مر نہ رہیو  
 ہمارا عمر بھر کا ساتھ ٹھیرا  
 سو میرے ساتھ تو دن بھر نہ رہیو  
 بہت دشوار ہو جائے گا جینا  
 یہاں تو ذات کے اندر نہ رہیو  
 سویرے ہی سے گھر آجانیو آج  
 بے روز واقعہ باہر نہ رہیو  
 کہیں چھپ جاؤ تم خانوں میں جا کر  
 شب فتنہ ہے اپنے گھر نہ رہیو  
 نظر پر بار ہو جاتے ہیں منظر  
 جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو  
 کام مجھ سے کوئی ہوا ہی نہیں  
 بات یہ ہے کہ میں تو تھا ہی نہیں  
 مجھ سے بچھڑی جو موج نکمت یار  
 پھر میں اس شہر میں رہا ہی نہیں  
 کس طرح ترک مدعا کیجے  
 جب کوئی اپنا مدعا ہی نہیں  
 کون ہوں میں جو رائیگاں ہی گیا  
 کون تھا جو کبھی ملا ہی نہیں  
 ہوں عجب عیش غم کی حالت میں  
 اب کسی سے کوئی گلہ ہی نہیں  
 بات ہے راستے پہ جانے کی  
 اور جانے کا راستہ ہی نہیں  
 بے خدا ہی پہ منحصر ہر بات  
 اور آفت یہ ہے خدا ہی نہیں  
 دل کی دنیا کچھ اور ہی ہوتی  
 کیا کہیں اپنا بس چلا ہی نہیں  
 اب تو مشکل ہے زندگی دل کی  
 یعنی اب کوئی ماجرا ہی نہیں  
 ہر طرف ایک حشر برپا ہے  
 جو خود سے نکل کے جا ہی نہیں  
 موج اتی تھی ٹھہرنے کی جہاں  
 اب وہاں خیمہ صبا ہی نہیں  
 ہم کہاں اور تم کہاں جاناں  
 ہیں کئی بجر درمیاں جاناں  
 رائیگاں وصل میں بھی وقت ہوا  
 پر ہوا خوب رائیگاں جاناں

میرے اندر ہی تو کہیں گم ہے  
کس سے پوچھوں ترا نشانِ جاناں  
عالم بیکرانِ رنگ ہے تو  
تجھ میں ٹھہروں کہاں کہاں جاناں  
میں ہواؤں سے کیسے پیش آؤں  
یہی موسم ہے کیا وہاں جاناں  
روشنی بھر گئی نگاہوں میں  
ہو گئے خواب ہے اماں جاناں  
دردِ مندان کوئے دل داری  
گئے غارت جہاں تھاں جاناں  
اب بھی جھیلوں میں عکس پڑتے ہیں  
اب بھی نیلا ہے آسماں جاناں  
ہے جو پرخوں تمہارا عکس خیال  
زخم آئے کہاں کہاں جاناں  
عجب حالتِ ہماری ہو گئی ہے  
یہ دنیا اب تمہاری ہو گئی ہے  
سخن میرا اداسی ہے سرِ شام  
جو خاموشی پہ طاری ہو گئی ہے  
بہت ہی خوش ہے دل اپنے کبے پر  
زمانے بھر میں خواری ہو گئی ہے  
وہ نازک لب ہے اب جانے ہی والا  
مری آواز بھاری ہو گئی ہے  
دل اب دنیا پہ لعنت کر کہ اس کی  
بہت خدمت گزاری ہو گئی ہے  
یقین معذور ہے اب اور گماں بھی  
بڑی ہے روزگاری ہو گئی ہے  
وہ اک بادِ شمالی رنگ جو تھی  
شمیم اس کی سواری ہو گئی ہے  
مرے پاس آ کے خنجر بھونک دے تو  
بہت نیزہ گزاری ہو گئی ہے  
کبھی کبھی تو بہت یاد آئے لگتے ہو  
کہ روٹھتے ہو کبھی اور منائے لگتے ہو  
گلا تو یہ ہے تم آتے نہیں کبھی لیکن  
جب آتے بھی ہو تو فوراً ہی جانے لگتے ہو  
یہ بات جو تمہاری مذاق ہے کہ نہیں  
کہ جو بھی ہو اسے تم آزمانے لگتے ہو  
تمہاری شاعری کیا ہے برا بھلا کیا ہے  
تم اپنے دل کی اداسی کو گانے لگتے ہو  
سرود آتشِ زرینِ صحنِ خاموشی  
وہ داغ ہے جسے ہر شب جلانے لگتے ہو  
سنا ہے کابکشانوں میں روز و شب ہی نہیں  
تو پھر تم اپنی زباں کیوں جلانے لگتے ہو  
ذکر بھی اس سے کیا بھلا میرا  
اس سے رشتہ ہی کیا رہا میرا  
آج مجھ کو بہت برا کہہ کر  
آپ نے نام تو لیا میرا  
آخری بات تم سے کہنا ہے  
یاد رکھنا نہ تم کہا میرا  
اب تو کچھ بھی نہیں ہوں میں ویسے  
کبھی وہ بھی تھا مبتلا میرا



وہ بھی منزل تلک پہنچ جاتا  
اس نے ڈھونڈا نہیں پتا میرا  
تجھ سے مجھ کو نجات مل جائے  
تو دعا کر کہ ہو پہلا میرا  
کیا بتاؤں بچھڑ گیا یاراں  
ایک بلقیس سے سب میرا  
اپنی منزل کا راستہ بھیجو  
جان ہم کو وہاں بلا بھیجو  
کیا ہمارا نہیں رہا ساون  
زلف یاں بھی کوئی گھٹا بھیجو  
نئی کلیاں جو اب کھلی ہیں وہاں  
ان کی خوشبو کو اک ذرا بھیجو  
ہم نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں  
درد بھیجو نہ تم دوا بھیجو  
دھول اڑتی ہے جو اس آنگن میں  
اس کو بھیجو صبا صبا بھیجو  
اے فقیر و گلی کے اس گل کی  
تم ہمیں اپنی خاک پا بھیجو  
شفق شام بجر کے ہاتھوں  
اپنی اتری ہوئی قبا بھیجو  
کچھ تو رشتہ ہے تم سے کم بختوں  
کچھ نہیں کوئی بد دعا بھیجو  
اے کوئے بار تیرے زمانے گزر گئے  
جو اپنے گھر سے آئے تھے وہ اپنے گھر گئے  
اب کون زخم و زہر سے رکھے گا سلسلہ  
جینے کی اب ہوس ہے ہمیں ہم تو مر گئے  
اب کیا کہوں کہ سارا محلہ ہے شرمسار  
میں ہوں عذاب میں کہ مرے زخم بھر گئے  
ہم نے بھی زندگی کو تماشا بنا دیا  
اس سے گزر گئے کبھی خود سے گزر گئے  
تھا رن بھی زندگی کا عجب طرفہ ماجرا  
یعنی اٹھے تو پاؤں مگر جون سر گئے  
آج بھی تشنگی کی قسمت میں  
سم قاتل ہے سلسبیل نہیں  
سب خدا کے وکیل ہیں لیکن  
آدمی کا کوئی وکیل نہیں  
ہے کشادہ ازل سے روئے زمیں  
حرم و دیر ہے فصیل نہیں  
زندگی اپنے روگ سے ہے تباہ  
اور درماں کی کچھ سبیل نہیں  
تم بہت جاذب و جمیل سہی  
زندگی جاذب و جمیل نہیں  
نہ کرو بحث بار جاؤ گی  
حسن اتنی بڑی دلیل نہیں  
ہمارے زخم تمنا پرانے ہو گئے ہیں  
کہ اس گلی میں گئے اب زمانے ہو گئے ہیں  
تم اپنے چاہنے والوں کی بات مت سنو  
تمہارے چاہنے والے دوانے ہو گئے ہیں  
وہ زلف دھوپ میں فرقت کی آئی ہے جب یاد  
تو بادل آئے ہیں اور شامیانے ہو گئے ہیں

جو اپنے طور سے ہم نے کبھی گزارے تھے  
 وہ صبح و شام تو جیسے فسانے ہو گئے ہیں  
 عجب مہک تھی مرے گل ترے شبستان کی  
 سو بلبلوں کے وہاں آشیانے ہو گئے ہیں  
 ہمارے بعد جو آئیں انہیں مبارک ہو  
 جہاں تھے کنچ وہاں کارخانے ہو گئے ہیں  
 جو زندگی بچی ہے اسے مت گنوائیے  
 بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے بھول جائیے  
 ہر آن اک جدائی ہے خود اپنے آپ سے  
 ہر آن کا ہے زخم جو ہر آن کھائیے  
 تھی مشورت کی ہم کو بسانا ہے گھر نیا  
 دل نے کہا کہ میرے در و بام ڈھائیے  
 تھوکا ہے میں نے خون ہمیشہ مذاق میں  
 میرا مذاق آپ ہمیشہ اڑائیے  
 برگز مرے حضور کبھی آئیے نہ آپ  
 اور آئیے اگر تو خدا بن کے آئیے  
 اب کوئی بھی نہیں ہے کوئی دل محلے میں  
 کس کس گلی میں جائیے اور گل مچائیے  
 اک طور دہ صدی تھا جو ہے طور ہو گیا  
 اب جنتری بجائیے تاریخ گائیے  
 اک لال قلعہ تھا جو میاں زرد پڑ گیا  
 اب رنگ ریز کون سے کس جا سے لائیے  
 شاعر ہے آپ یعنی کہ سستے لطیف گو  
 رشتوں کو دل سے روئیے سب کو ہنسائیے  
 جو حالتوں کا دور تھا وہ تو گزر گیا  
 دل کو جلا چکے ہیں سو اب گھر جلائیے  
 اب کیا فریب دیجیے اور کس کو دیجیے  
 اب کیا فریب کھائیے اور کس سے کھائیے  
 بے یاد پر مدار میرے کاروبار کا  
 بے عرض آپ مجھ کو بہت یاد آئیے  
 بس فائلوں کا بوجھ اٹھایا کریں جناب  
 مصرعہ یہ جون کا ہے اسے مت اٹھائیے  
 بات کوئی امید کی مجھ سے نہیں کہی گئی  
 سو مرے خواب بھی گئے سو میری نیند بھی گئی  
 دل کا تھا ایک مدعا جس نے تباہ کر دیا  
 دل میں تھی ایک ہی تو بات وہ جو فقط سہی گئی  
 جاننے کیا تلاش تھی جون مرے وجود میں  
 جس کو میں ڈھونڈتا گیا جو مجھے ڈھونڈھتی گئی  
 ایک خوشی کا حال ہے خوش سخناں کے درمیاں  
 عزت شائقین غم تھی جو رہی سہی گئی  
 بود و نبود کی تمیز ایک عذاب تھی کہ تھی  
 یعنی تمام زندگی دھند میں ڈوبتی گئی  
 اس کے جمال کا تھا دن میرا وجود اور پھر  
 صبح سے دھوپ بھی گئی رات سے چاندنی گئی  
 جب میں تھا شہر ذات کا تھا مرا ہر نفس عذاب  
 پھر میں وہاں کا تھا جہاں حالت ذات بھی گئی  
 گرد فشاں ہوں دشت میں سینہ زناں ہوں شہر میں  
 تھی جو صبا ئے سمت دل جانے کہاں چلی گئی  
 تم نے بہت شراب پی اس کا سبھی کو دکھ ہے جون  
 اور جو دکھ ہے وہ یہ ہے تم کو شراب پی گئی

تم حقیقت نہیں ہو حسرت ہو  
جو ملے خواب میں وہ دولت ہو  
میں تمہارے ہی دم سے زندہ ہوں  
مر ہی جاؤں جو تم سے فرصت ہو  
تم ہو خوشبو کے خواب کی خوشبو  
اور اتنی ہی بے مروت ہو  
تم ہو پہلو میں پر قرار نہیں  
یعنی ایسا بے جیسے فرقت ہو  
تم ہو انگڑائی رنگ و نکہت کی  
کیسے انگڑائی سے شکایت ہو  
کس طرح چھوڑ دوں تمہیں جاناں  
تم مری زندگی کی عادت ہو  
کس لئے دیکھتی ہو آئینہ  
تم تو کھد سے بھی خوبصورت ہو  
داستان ختم ہونے والی ہے  
تم مری آخری محبت ہو  
اے وصل کچھ یہاں نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
اس جسم کی میں جاں نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
تو آج میرے گھر میں جو مہماں ہے عید ہے  
تو گھر کا میزبان نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
کھولی تو ہے زبان مگر اس کی کیا بساط  
میں زہر کی دکان نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
کیا ایک کاروبار تھا وہ ربط جسم و جاں  
کوئی بھی رائیگاں نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
کتنا جلا ہوا ہوں بس اب کیا بتاؤں میں  
عالم دھواں دھواں نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
دیکھا تھا جب کہ پہلے پہل اس نے آئینہ  
اس وقت میں وہاں نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
وہ اک جمال جلوہ فشاں ہے زمیں زمیں  
میں تا بہ آسمان نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
میں نے بس اک نگاہ میں طے کر لیا تجھے  
تو رنگ بیکراں نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
گم ہو کے جان تو مری اغوش ذات میں  
بے نام و بے نشان نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
بر کوئی درمیان ہے اے ماجرا فروش  
میں اپنے درمیان نہ ہوا کچھ نہیں ہوا  
اک سایہ مرا مسیحا تھا  
کون جانے وہ کون تھا کیا تھا  
وہ فقط صحن تک ہی اتنی تھی  
میں بھی حجرے سے کم نکلتا تھا  
تجھ کو بھولا نہیں وہ شخص کہ جو  
تیری بانہوں میں بھی اکیلا تھا  
جان لیوا تھیں خوابشیں ورنہ  
وصل سے انتظار اچھا تھا  
بات تو دل شکن ہے ہر بارو  
عقل سچی تھی عشق جھوٹا تھا  
اپنے معیار تک نہ پہنچا میں  
مجھ کو خود پر بڑا بھروسہ تھا  
جسم کی صاف گوئی کے با وصف  
روح نے کتنا جھوٹ بولا تھا

بے فصیلیں اٹھا رہا مجھ میں  
جانے یہ کون آ رہا مجھ میں  
جوّ مجھ کو جلا وطن کر کے  
وہ مرے بن بھلا رہا مجھ میں  
مجھ سے اس کو رہی تلاش امید  
سو بہت دن چھپا رہا مجھ میں  
تھا قیامت سکوت کا آشوب  
حشر سا اک بپا رہا مجھ میں  
پس پردہ کوئی نہ تھا پھر بھی  
ایک پردہ کھنچا رہا مجھ میں  
مجھ میں آ کے گرا تھا اک زخمی  
جانے کب تک پڑا رہا مجھ میں  
اتنا خالی تھا اندروں میرا  
کچھ دنوں تو خدا رہا مجھ میں  
یادوں کا حساب رکھ رہا ہوں  
سینے میں عذاب رکھ رہا ہوں  
تم کچھ کہے جاؤ کیا کہوں میں  
بس دل میں جواب رکھ رہا ہوں  
دامن میں کیے ہیں جمع گرداب  
جیبوں میں حباب رکھ رہا ہوں  
اُٹے گا وہ نخوتی سو میں بھی  
کمرے کو خراب رکھ رہا ہوں  
تم پر میں صحیفہ بائے کہنہ  
اک تازہ کتاب رکھ رہا ہوں  
خون تھو کے گی زندگی کب تک  
یاد اُٹے گی اب تری کب تک  
جانے والوں سے پوچھنا یہ صبا  
رہے آباد دل گلی کب تک  
بو کبھی تو شراب وصل نصیب  
پیے جاؤں میں خون ہی کب تک  
دل نے جو عمر بھر کمائی ہے  
وہ دکھن دل سے جانے گی کب تک  
جس میں تھا سوز آرزو اس کا  
شب غم وہ ہوا چلی کب تک  
بنی آدم کی زندگی ہے عذاب  
یہ خدا کو رلائے گی کب تک  
حادثہ زندگی ہے آدم کی  
ساتھ دے گی بھلا خوشی کب تک  
بے جہنم جو یاد اب اس کی  
وہ بہشت وجود تھی کب تک  
وہ صبا اس کے بن جو آئی تھی  
وہ اسے پوچھتی رہی کب تک  
میرِ جونی ذرا بتائیں تو  
خود میں ٹھہریں گے آپ ہی کب تک  
حال صحن وجود ٹھہرے گا  
تیرا بنگام رخصتی کب تک  
شوق کا رنگ بجھ گیا یاد کے زخم بھر گئے  
کیا مری فصل ہو چکی کیا مرے دن گزر گئے  
رہ گزر خیال میں دوش بدوش تھے جو لوگ  
وقت کی گرد باد میں جانے کہاں بکھر گئے

شام ہے کتنی ہے تپاک شہر ہے کتنا سہم ناک  
ہم نفسو کہاں ہو تم جانے یہ سب کدھر گئے  
پاس حیات کا خیال ہم کو بہت برا لگا  
پس ہم ہجوم معرکہ جان کے ہے سپر گئے  
میں تو صفوں کے درمیاں کب سے پڑا ہوں نیم جاں  
میرے تمام جاں نثار میرے لیے تو مر گئے  
گنوائی کس کی تمنا میں زندگی میں نے  
وہ کون ہے جسے دیکھا نہیں کبھی میں نے  
ترا خیال تو ہے پر ترا وجود نہیں  
ترے لیے تو یہ محفل سجانی تھی میں نے  
ترے عدم کو گوارا نہ تھا وجود مرا  
سو اپنی بیخ کنی کی کمی نہ کی میں نے  
ہیں میری ذات سے منسوب صد فسانہ عشق  
اور ایک سطر بھی اب تک نہیں لکھی میں نے  
خود اپنے عشوہ و انداز کا شہید ہوں میں  
خود اپنی ذات سے برتی ہے بے رخی میں نے  
مرے حریف مری یکے تازیوں پہ نثار  
تمام عمر حلیفوں سے جنگ کی میں نے  
خراشِ نغمہ سے سینہ چھلا ہوا ہے مرا  
فغاں کہ ترک نہ کی نغمہ پروری میں نے  
دوا سے فائدہ مقصود تھا ہی کب کہ فقط  
دوا کے شوق میں صحت تباہ کی میں نے  
زبانہ زن تھا جگر سوز تشنگی کا عذاب  
سو جوف سینہ میں دوزخ انڈیل لی میں نے  
سرور مے پہ بھی غالب رہا شعور مرا  
کہ ہر رعایت غم ذہن میں رکھی میں نے  
غم شعور کوئی دم تو مجھ کو مہلت دے  
تمام عمر جلایا ہے اپنا جی میں نے  
علاج یہ ہے کہ مجبور کر دیا جاؤں  
وگرنہ یوں تو کسی کی نہیں سنی میں نے  
رہا میں شاید تنہا نشین مسند غم  
اور اپنے کرب انا سے غرض رکھی میں نے  
تجھ سے گلے کروں تجھے جاناں مناؤں میں  
اک بار اپنے آپ میں آؤں تو آؤں میں  
دل سے ستم کی ہے سر و کاری ہوا کو ہے  
وہ گرد اڑ رہی ہے کہ خود کو گنواؤں میں  
وہ نام ہوں کہ جس پہ ندامت بھی اب نہیں  
وہ کام ہیں کہ اپنی جدائی کماؤں میں  
کیوں کر ہو اپنے خواب کی آنکھوں میں واپسی  
کس طور اپنے دل کے زمانوں میں جاؤں میں  
اک رنگ سی کمان ہو خوشبو سا ایک تیر  
مریم سی واردات ہو اور زخم کھاؤں میں  
شکوہ سا اک دریچہ ہو نشہ سا اک سکوت  
ہو شام اک شراب سی اور لڑکھڑاؤں میں  
پھر اس گلی سے اپنا گزر چاہتا ہے دل  
اب اس گلی کو کون سی بستی سے لاؤں میں  
یاد اسے انتہائی کرتے ہیں  
سو ہم اس کی برائی کرتے ہیں  
پسند آتا ہے دل سے یوسف کو  
وہ جو یوسف کے بھائی کرتے ہیں

ہے بدن خواب وصل کا دنگل  
اؤ زور آزمائی کرتے ہیں  
اس کو اور غیر کو خبر ہی نہیں  
ہم لگائی بجھائی کرتے ہیں  
ہم عجب ہیں کہ اس کی بانہوں میں  
شکوہ نارسائی کرتے ہیں  
حالت وصل میں بھی ہم دونوں  
لمحہ لمحہ جدائی کرتے ہیں  
آپ جو میری جاں ہیں میں دل ہوں  
مجھ سے کیسے جدائی کرتے ہیں  
با وفا ایک دوسرے سے میاں  
ہر نفس ہے وفائی کرتے ہیں  
جو ہیں سرحد کے پار سے آئے  
وہ بہت خود ستائی کرتے ہیں  
پل قیامت کے سود خوار ہیں جون  
یہ ابد کی کمائی کرتے ہیں  
باہر گزار دی کبھی اندر بھی آئیں گے  
ہم سے یہ پوچھنا کبھی ہم گھر بھی آئیں گے  
خود اپنی نہیں ہو تو پوشش ہو اپنی  
یوں شیشہ ہی رہو گے تو پتھر بھی آئیں گے  
یہ دشت ہے طرف ہے گمانوں کا موج خیز  
اس میں سراپ کیا کہ سمندر بھی آئیں گے  
آشفتگی کی فصل کا آغاز ہے ابھی  
آشفتگاں پلٹ کے ابھی گھر بھی آئیں گے  
دیکھیں تو چل کے یار طلسمات سمت دل  
مرنا بھی پڑ گیا تو چلو مر بھی آئیں گے  
یہ شخص آج کچھ نہیں پر کل یہ دیکھیو  
اس کی طرف قدم ہی نہیں سر بھی آئیں گے  
ضبط کر کے ہنسی کو بھول گیا  
میں تو اس زخم ہی کو بھول گیا  
ذات در ذات ہم سفر رہ کر  
اجنبی اجنبی کو بھول گیا  
صبح تک وجہ جاں کٹی تھی جو بات  
میں اسے شام ہی کو بھول گیا  
عہد وابستگی گزار کے میں  
وجہ وابستگی کو بھول گیا  
سب دلیلیں تو مجھ کو یاد رہیں  
بحث کیا تھی اسی کو بھول گیا  
کیوں نہ ہو ناز اس ذہانت پر  
ایک میں ہر کسی کو بھول گیا  
سب سے پر امن واقعہ یہ ہے  
آدمی آدمی کو بھول گیا  
قہقہہ مارتے ہی دیوانہ  
ہر غم زندگی کو بھول گیا  
خواب با خواب جس کو چاہا تھا  
رنگ با رنگ اسی کو بھول گیا  
کیا قیامت ہوئی اگر اک شخص  
اپنی خوش قسمتی کو بھول گیا  
بند باہر سے مری ذات کا در ہے مجھ میں  
میں نہیں خود میں یہ اک عام خبر ہے مجھ میں

اک عجب آمد و شد ہے کہ نہ ماضی ہے نہ حال  
 جوں برپا کئی نسلوں کا سفر ہے مجھ میں  
 ہے مری عمر جو حیران تماشائی ہے  
 اور اک لمحہ ہے جو زیر و زبر ہے مجھ میں  
 کیا ترستا ہوں کہ باہر کے کسی کام آئے  
 وہ اک انبوہ کہ بس خاک بسر ہے مجھ میں  
 ڈوبنے والوں کے دریا مجھے پایاب ملے  
 اس میں اب ڈوب رہا ہوں جو بھنور ہے مجھ میں  
 در و دیوار تو باہر کے ہیں ڈھانے والے  
 چاہے رہتا نہیں میں پر مرا گھر ہے مجھ میں  
 میں جو پیکار میں اندر کی ہوں ہے تیغ و زرہ  
 آخرش کون ہے جو سینہ سپر ہے مجھ میں  
 معرکہ گرم ہے بے طور سا کوئی ہر دم  
 نہ کوئی تیغ سلامت نہ سپر ہے مجھ میں  
 زخم یا زخم ہوں اور کوئی نہیں خوں کا نشان  
 کون ہے وہ جو مرے خوں میں تر ہے مجھ میں  
 نشہ شوق رنگ میں تجھ سے جدائی کی گئی  
 ایک لکیر خوں کی بیچ میں کھینچ دی گئی  
 تھی جو کبھی سر سخن میری وہ خاموشی گئی  
 بائے کہن سنن کی بات بائے وہ بات ہی گئی  
 شوق کی ایک عمر میں کیسے بدل سکے گا دل  
 نبض جنوں ہی تو تھی شہر میں ڈوبتی گئی  
 اس کی گلی سے اٹھ کے میں آن پڑا تھا اپنے گھر  
 ایک گلی کی بات تھی اور گلی گلی گئی  
 اس کی امید ناز کا مجھ سے یہ مان تھا کہ آپ  
 عمر گزار دیجیے عمر گزار دی گئی  
 دور بہ دور دل بہ دل درد بہ درد دم بہ دم  
 تیرے یہاں رعایت حال نہیں رکھی گئی  
 جوں جنوب زرد کے خاک بسر یہ دکھ اٹھا  
 موج شمال سبز جاں آئی تھی اور چلی گئی  
 کیا وہ گماں نہیں رہا ہاں وہ گماں نہیں رہا  
 کیا وہ امید بھی گئی ہاں وہ امید بھی گئی  
 سوچا ہے کہ اب کار مسیحا نہ کریں گے  
 وہ خون بھی تھوکے گا تو پروا نہ کریں گے  
 اس بار وہ تلخی ہے کہ روٹھے بھی نہیں ہم  
 اب کے وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے  
 یاں اس کے سلیقے کے ہیں آثار تو کیا ہم  
 اس پر بھی یہ کمرا تہ و بالا نہ کریں گے  
 اب نغمہ طرازان برافروختہ اے شہر  
 واسوخت کہیں گے غزل انشا نہ کریں گے  
 ایسا ہے کہ سینے میں سلگتی ہیں خراشیں  
 اب سانس بھی ہم لیں گے تو اچھا نہ کریں گے  
 تم سے بھی اب تو جا چکا ہوں میں  
 دور یا دور آ چکا ہوں میں  
 یہ بہت غم کی بات ہو شاید  
 اب تو غم بھی گنوا چکا ہوں میں  
 اس گماں گماں کے عالم میں  
 آخرش کیا بھلا چکا ہوں میں  
 اب ببر شیر اشتہا ہے مری  
 شاعروں کو تو کھا چکا ہوں میں

میں ہوں معماری پر یہ بتلا دوں  
شہر کے شہر ڈھ چکا ہوں میں  
حال ہے اک عجب فراغت کا  
اپنا ہر غم منا چکا ہوں میں  
لوگ کہتے ہیں میں نے جوگ لیا  
اور دھونی رما چکا ہوں میں  
نہیں املا درست غالب کا  
شیفتہ کو بتا چکا ہوں میں  
کب اس کا وصال چاہیے تھا  
بس ایک خیال چاہیے تھا  
کب دل کو جواب سے غرض تھی  
ہونٹوں کو سوال چاہیے تھا  
شوق ایک نفس تھا اور وفا کو  
پاس مہ و سال چاہیے تھا  
اک چہرہ سادہ تھا جو ہم کو  
بے مثل و مثال چاہیے تھا  
اک کرب میں ذات و زندگی ہیں  
ممکن کو محال چاہیے تھا  
میں کیا ہوں بس اک ملال ماضی  
اس شخص کو حال چاہیے تھا  
ہم تم جو بچھڑ گئے ہیں ہم کو  
کچھ دن تو ملال چاہیے تھا  
وہ جسم جمال تھا سراپا  
اور مجھ کو جمال چاہیے تھا  
وہ شوخ رمیدہ مجھ کو اپنی  
بانہوں میں نڈھال چاہیے تھا  
تھا وہ جو کمال شوق و صلت  
خوابش کو زوال چاہیے تھا  
جو لمحہ ہم لمحہ مل رہا ہے  
وہ سال ہم سال چاہیے تھا  
دل برباد کو آباد کیا ہے میں نے  
آج مدت میں تمہیں یاد کیا ہے میں نے  
ذوق پرواز تب و تاب عطا فرما کر  
صید کو لائق صیاد کیا ہے میں نے  
تلخی دور گزشتہ کا تصور کر کے  
دل کو پھر مائل فریاد کیا ہے میں نے  
آج اس سوز تصور کی خوشی میں لے دوست  
طائر صبر کو آزاد کیا ہے میں نے  
ہو کے اصرار غم تازہ سے مجبور فغاں  
چشم کو اشک تر امداد کیا ہے میں نے  
تم جسے کہتے تھے ہنگامہ پسندی میری  
پھر وہی طرز غم ایجاد کیا ہے میں نے  
پھر گوارا ہے مجھے عشق کی ہر اک مشکل  
تازہ پھر شیوہ برباد کیا ہے میں نے  
دل پریشاں ہے کیا کیا جائے  
عقل حیراں ہے کیا کیا جائے  
شوق مشکل پسند ان کا حصول  
سخت آساں ہے کیا کیا جائے  
عشق خواباں کے ساتھ ہی ہم میں  
ناز خواباں ہے کیا کیا جائے



بے سبب ہی مری طبیعت غم  
 سب سے نالاں بے کیا کیا جائے  
 باوجود ان کی دل نوازی کے  
 دل گریزاں بے کیا کیا جائے  
 میں تو نقد حیات لایا تھا  
 جنس ارزاں بے کیا کیا جائے  
 ہم سمجھتے تھے عشق کو دشوار  
 یہ بھی آساں بے کیا کیا جائے  
 وہ بہاروں کی ناز پروردہ  
 ہم یہ نازاں بے کیا کیا جائے  
 مصر لطف و کرم میں بھی اے جو  
 یاد کنعاں بے کیا کیا جائے  
 جانے کہاں گیا ہے وہ وہ جو ابھی یہاں تھا  
 وہ جو ابھی یہاں تھا وہ کون تھا کہاں تھا  
 تا لمحہ گزشتہ یہ جسم اور سائے  
 زندہ تھے رائیگاں میں جو کچھ تھا رائیگاں تھا  
 اب جس کی دید کا ہے سودا ہمارے سر میں  
 وہ اپنی ہی نظر میں اپنا ہی اک سماں تھا  
 کیا کیا نہ خون تھوکا میں اس گلی میں یارو  
 سچ جاننا وہاں تو جو فن تھا رائیگاں تھا  
 یہ وار کر گیا ہے پہلو سے کون مجھ پر  
 تھا میں ہی دائیں بائیں اور میں ہی درمیاں تھا  
 اس شہر کی حفاظت کرنی تھی ہم کو جس میں  
 آندھی کی تھیں فصیلیں اور گرد کا مکاں تھا  
 تھی اک عجب فضا سی امکان خال و خد کی  
 تھا اک عجب مصور اور وہ مرا گماں تھا  
 عمریں گزر گئی تھیں ہم کو یقیں سے بچھڑے  
 اور لمحہ اک گماں کا صدیوں میں بے اماں تھا  
 جب ڈوبتا چلا میں تاریکیوں کی تہ میں  
 تہ میں تھا اک دریچہ اور اس میں آسماں تھا  
 خود میں ہی گزر کے تھک گیا ہوں  
 میں کام نہ کر کے تھک گیا ہوں  
 اوپر سے اتر کے تازہ دم تھا  
 نیچے سے اتر کے تھک گیا ہوں  
 اب تم بھی تو جی کے تھک رہے ہو  
 اب میں بھی تو مر کے تھک گیا ہوں  
 میں یعنی ازل کا آرمیدہ  
 لمحوں میں بکھر کے تھک گیا ہوں  
 اب جان کا میری جسم شل ہے  
 میں خود سے ہی ڈر کے تھک گیا ہوں  
 بد دلی میں بے قراری کو قرار آیا تو کیا  
 پا پیادہ ہو کے کوئی شہسوار آیا تو کیا  
 زندگی کی دھوپ میں مرجھا گیا میرا شباب  
 اب بہار آئی تو کیا اب بہار آیا تو کیا  
 میرے تیور بجھ گئے میری نگاہیں جل گئی  
 اب کوئی آئینہ رو آئینہ دار آیا تو کیا  
 اب کم جب جانانہ تم کو بے سبھی پر اعتبار  
 اب تمہیں جانانہ پہ جب اعتبار آیا تو کیا  
 اب مجھے خود اپنی بابوں پر نہیں بے اختیار  
 باتھ پھیلائے کوئی بے اختیار آیا تو کیا

وہ تو اب بھی خواب ہے بے دار بینائی کا خواب  
 زندگی میں خواب میں اس کے گزار آیا تو کیا  
 ہم یہاں ہیں بے گناہ سو ہم میں سے جو ایلیا  
 کوئی جیت آیا یہاں اور کوئی بار آیا تو کیا  
 نام ہی کیا نشان ہی کیا خواب و خیال ہو گئے  
 تیری مثال دے کے ہم تیری مثال ہو گئے  
 سایہ ذات سے بھی ہم عکس صفات سے بھی ہم  
 دشت غزل میں آ کے دیکھ ہم تو غزال ہو گئے  
 کہتے ہی نشہ ہائے ذوق کتنے ہی جذبہ ہائے شوق  
 رسم تپاک بار سے رو بہ زوال ہو گئے  
 عشق ہے اپنا پائیدار تیری وفا ہے استوار  
 ہم تو ہلاک ورزش فرض محال ہو گئے  
 جادہ شوق میں پڑا قحط غبار کارواں  
 واں کے شجر تو سر بسر دست سوال ہو گئے  
 سخت زمیں پرست تھے عہد وفا کے پاسدار  
 اڑ کے بلندیوں میں ہم گرد ملال ہو گئے  
 قرب جمال اور ہم عیش وصال اور ہم  
 ہاں یہ ہوا کہ ساکن شہر جمال ہو گئے  
 ہم نفسان وضع دار مستمعان برد بار  
 ہم تو تمہارے واسطے ایک وبال ہو گئے  
 کون سا قافلہ ہے یہ جس کے جرس کا ہے یہ شور  
 میں تو نڈھال ہو گیا ہم تو نڈھال ہو گئے  
 خار بہ خار گل بہ گل فصل بہار آ گئی  
 فصل بہار آ گئی زخم بحال ہو گئے  
 شور اٹھا مگر تجھے لذت گوش تو ملی  
 خون بہا مگر ترے ہاتھ تو لال ہو گئے  
 جون کرو گے کب تلک اپنا مثالیہ تلاش  
 اب کئی بجر ہو چکے اب کئی سال ہو گئے  
 یہ پیہم تلخ کامی سی رہی کیا  
 محبت زہر کھا کے اُٹی تھی کیا  
 مجھے اب تم سے ڈر لگنے لگا ہے  
 تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی کیا  
 شکست اعتماد ذات کے وقت  
 قیامت آ رہی تھی آ گئی کیا  
 مجھے شکوہ نہیں بس پوچھنا ہے  
 یہ تم ہنستی ہو اپنی ہی ہنسی کیا  
 ہمیں شکوہ نہیں اک دوسرے سے  
 منانا چاہیے اس پر خوشی کیا  
 پڑے ہیں ایک گوش میں گماں کے  
 بھلا ہم کیا ہماری زندگی کیا  
 میں رخصت ہو رہا ہوں پر تمہاری  
 اداسی ہو گئی ہے ملتوی کیا  
 میں اب ہر شخص سے اکتا چکا ہوں  
 فقط کچھ دوست ہیں اور دوست بھی کیا  
 محبت میں ہمیں پاس آنا تھا  
 بدن کی اشتہا صادق نہ تھی کیا  
 نہیں رشتہ سموچہ زندگی سے  
 نہ جانے ہم میں ہے اپنی کمی کیا  
 ابھی ہونے کی باتیں ہیں سو کر لو  
 ابھی تو کچھ نہیں ہونا ابھی کیا

بہی پوچھا کیا میں آج دن بھر  
بر اک انسان کو روٹی ملی کیا  
یہ ربط ہے شکایت اور یہ میں  
جو شے سینے میں تھی وہ بجھ گئی کیا  
تجھ میں پڑا ہوا ہوں حرکت نہیں ہے مجھ میں  
حالت نہ پوچھیو تو حالت نہیں ہے مجھ میں  
اب تو نظر میں آ جا بانہوں کے گھر میں آ جا  
اے جان تیری کوئی صورت نہیں ہے مجھ میں  
اے رنگ رنگ میں آ آغوش تنگ میں آ  
باتیں ہی رنگ کی ہیں رنگت نہیں ہے مجھ میں  
اپنے میں ہی کسی کی ہو روبروی مجھ کو  
ہوں خود سے روبرو ہوں ہمت نہیں ہے مجھ میں  
اب تو سمٹ کے آ جا اور روح میں سما جا  
ویسے کسی کی پیارے وسعت نہیں ہے مجھ میں  
شیشے کے اس طرف سے میں سب کو تک رہا ہوں  
مرنے کی بھی کسی کو فرصت نہیں ہے مجھ میں  
تم مجھ کو اپنے رم میں لے جاؤ ساتھ اپنے  
اپنے سے اے غزالو وحشت نہیں ہے مجھ میں  
مجھے غرض ہے مری جان غل مچانے سے  
نہ تیرے آنے سے مطلب نہ تیرے جانے سے  
عجیب ہے مری فطرت کہ آج ہی مثلاً  
مجھے سکون ملا ہے ترے نہ آنے سے  
اک اجتہاد کا پہلو ضرور ہے تجھ میں  
خوشی ہوئی ترے نا وقت مسکرانے سے  
یہ میرا جوش محبت فقط عبارت ہے  
تمہاری چمپنی رانوں کو نوچ کھانے سے  
مہذب آدمی پتلون کے بٹن تو لگا  
کہ ارتقا ہے عبارت بٹن لگانے سے  
مجھ کو تو گر کے مرنا ہے  
باقی کو کیا کرنا ہے  
شہر ہے چہروں کی تمثیل  
سب کا رنگ اترنا ہے  
وقت ہے وہ نائک جس میں  
سب کو ڈرا کر ڈرنا ہے  
میرے نقش ثانی کو  
مجھ میں ہی سے ابھرنا ہے  
کیسی تلافی کیا تدبیر  
کرنا ہے اور بھرنا ہے  
جو نہیں گزرا ہے اب تک  
وہ لمحہ تو گزرنا ہے  
اپنے گماں کا رنگ تھا میں  
اب یہ رنگ بکھرنا ہے  
ہم دو پائے ہیں سو ہمیں  
میز پہ جا کر چرنا ہے  
چاہے ہم کچھ بھی کر لیں  
ہم ایسوں کو سدھرنا ہے  
ہم تم ہیں اک لمحہ کے  
پھر بھی وعدہ کرنا ہے  
دولت دہر سب لٹائی ہے  
میں نے دل کی کمائی کھائی ہے

ایک لمحے کو تیر کرنے میں  
میں نے اک زندگی گنوائی ہے  
وہ جو سرمایہ دل و جاں تھی  
اب وہی آرزو پرانی ہے  
تو بے آخر کہاں کہ آج مجھے  
بے طرح اپنی یاد آئی ہے  
جان جاں تجھ سے دو بدو ہو کر  
میں نے خود سے شکست کھائی ہے  
عشق میرے گمان میں یاراں  
دل کی اک زور آزمائی ہے  
اس میں رہ کر بھی میں نہیں اس میں  
جانے دل میں کیا سمائی ہے  
موج باد صبا پہ ہو کے سوار  
وہ شمیم خیال آئی ہے  
شرم کر تو کہ دشت حالت میں  
تیری لیلٰی نے خاک اڑائی ہے  
بک نہیں پا رہا تھا سو میں نے  
اپنی قیمت بہت بڑھائی ہے  
وہ جو تھا جون وہ کہیں بھی نہ تھا  
حسن اک خواب کی جدائی ہے  
سمجھ میں زندگی اُٹے کہاں سے  
پڑھی ہے یہ عبارت درمیاں سے  
یہاں جو ہے تنفس ہی میں گم ہے  
پرندے اڑ رہے ہیں شاخ جاں سے  
مکان و لا مکان کے بیچ کیا ہے  
جدا جس سے مکان ہے لا مکان سے  
دریچہ باز ہے یادوں کا اور میں  
ہوا سنتا ہوں میں پیڑوں کی زباں سے  
تھا اب تک معرکہ بابر کا درپیش  
ابھی تو گھر بھی جانا ہے یہاں سے  
زمانہ تھا وہ دل کی زندگی کا  
تری فرقت کے دن لاؤں کہاں سے  
فلاں سے تھی غزل بہتر فلاں کی  
فلاں کے زخم اچھے تھے فلاں سے  
روٹھا تھا تجھ سے یعنی خود اپنی خوشی سے میں  
پھر اس کے بعد جان نہ روٹھا کسی سے میں  
بانہوں سے میری وہ ابھی رخصت نہیں ہوا  
پر گم ہوں انتظار میں اس کے ابھی سے میں  
دم بھر تری بوس سے نہیں ہے مجھے قرار  
بلکان ہو گیا ہوں تری دل کشی سے میں  
اس طور سے ہوا تھا جدا اپنی جان سے  
جیسے بھلا سکوں گا اسے آج ہی سے میں  
اے طراحدار عشوہ طراز دیار ناز  
رخصت ہوا ہوں تیرے لیے دل گلی سے میں  
تو ہی حریم جلوہ ہے بنگام رنگ ہے  
جاناں بہت اداس ہوں اپنی کمی سے میں  
کچھ تو حساب چاہئے آئینے سے تجھے  
لوں گا ترا حساب مری جاں تجھی سے میں  
بزم سے جب نگار اٹھتا ہے  
میرے دل سے غبار اٹھتا ہے

میں جو بیٹھا ہوں تو وہ خوش قامت  
دیکھ لو بار بار اٹھتا ہے  
تیری صورت کو دیکھ کر مری جاں  
خود بخود دل میں پیار اٹھتا ہے  
اس کی گل گشت سے روش بہ روش  
رنگ ہی رنگ یار اٹھتا ہے  
تیرے جاتے ہی اس خرابے سے  
شور گریہ بزار اٹھتا ہے  
کون ہے جس کو جاں عزیز نہیں  
لے ترا جاں نثار اٹھتا ہے  
صف بہ صف اکھڑے ہوئے ہیں غزال  
دشت سے خاکسار اٹھتا ہے  
ہے یہ تیشہ کہ ایک شعلہ سا  
بر سر کہسار اٹھتا ہے  
کرب تنہائی ہے وہ شے کہ خدا  
آدمی کو پکار اٹھتا ہے  
تو نے پھر کسب زر کا ذکر کیا  
کہیں ہم سے یہ بار اٹھتا ہے  
لو وہ مجبور شہر صحرا سے  
آج دیوانہ وار اٹھتا ہے  
اپنے یاں تو زمانے والوں کا  
روز ہی اعتبار اٹھتا ہے  
جون اٹھتا ہے یوں کہو یعنی  
میر و غالب کا یار اٹھتا ہے  
شاخ امید جل گئی ہوگی  
دل کی حالت سنبھل گئی ہوگی  
جون اس آن تک بخیر ہوں میں  
زندگی داؤ چل گئی ہوگی  
اک جہنم ہے میرا سینہ بھی  
آرزو کب کی گل گئی ہوگی  
سوزش پر تو نگاہ نہ پوچھ  
مردمک تو پگھل گئی ہوگی  
ہم نے دیکھے تھے خواب شعلوں کے  
نہند آنکھوں میں جل گئی ہوگی  
اس نے مایوس کر دیا ہوگا  
پھانس دل سے نکل گئی ہوگی  
اب تو دل ہی بدل گیا اب تو  
ساری دنیا بدل گئی ہوگی  
دل گئی میں رقیب دل کا جلوس  
واں تو تلوار چل گئی ہوگی  
گھر سے جس روز میں چلا ہوں گا  
دل کی دلی مچل گئی ہوگی  
دھوپ یعنی کہ زرد زرد اک دھوپ  
لال قلعے سے ڈھل گئی ہوگی  
بجر حدت میں باد کی خوشبو  
ایک پنکھا سا جھل گئی ہوگی  
اُنی تھی موج سبز باد شمال  
یاد کی شاخ پھل گئی ہوگی  
وہ دم صبح غسل خانے میں  
میرے پہلو سے شل گئی ہوگی

شام صبح فراق دائم ہے  
اب طبیعت بہل گئی ہوگی  
ہم رہے پر نہیں رہے آباد  
یاد کے گھر نہیں رہے آباد  
کتنی آنکھیں بوئیں ہلاک نظر  
کتنے منظر نہیں رہے آباد  
ہم کہ اے دل سخن تھے سر تا پا  
ہم لبوں پر نہیں رہے آباد  
شہر دل میں عجب محلے تھے  
ان میں اکثر نہیں رہے آباد  
جانے کیا واقعہ ہوا کیوں لوگ  
اپنے اندر نہیں رہے آباد  
بجا ارشاد فرمایا گیا ہے  
کہ مجھ کو یاد فرمایا گیا ہے  
عنایت کی ہیں نا ممکن امیدیں  
کرم ایجاد فرمایا گیا ہے  
ہیں اب ہم اور زد ہے حادثوں کی  
ہمیں آزاد فرمایا گیا ہے  
ذرا اس کی پر احوالی تو دیکھیں  
جسے برباد فرمایا گیا ہے  
نسیم سبزی تھے ہم سو ہم کو  
غبار افتاد فرمایا گیا ہے  
مبارک فال نیک اے خسرو شہر  
مجھے برباد فرمایا گیا ہے  
سند بخشی ہے عشق ہے غرض کی  
بہت ہی شاد فرمایا گیا ہے  
سلیقے کو لب فریاد تیرے  
ادا کی داد فرمایا گیا ہے  
کہاں ہم اور کہاں حسن سر بام  
ہمیں بنیاد فرمایا گیا ہے  
گفتگو جب محال کی ہوگی  
بات اس کی مثال کی ہوگی  
زندگی ہے خیال کی اک بات  
جو کسی ہے خیال کی ہوگی  
تھی جو خوشبو صبا کی چادر میں  
وہ تمہاری ہی شال کی ہوگی  
نہ سمجھ پائیں گے وہ اہل فراق  
جو اذیت وصال کی ہوگی  
دل پہ طاری ہے اک کمال خوشی  
شاید اپنے زوال کی ہوگی  
جو عطا ہو وصال جانان کی  
وہ اداسی کمال کی ہوگی  
آج کہنا ہے دل کو حال اپنا  
آج تو سب کے حال کی ہوگی  
ہو چکا میں سو فکر یاروں کو  
اب مری دیکھ بھال کی ہوگی  
اب خلش کیا فراق کی اس کے  
اک خلش ماہ و سال کی ہوگی  
کفر و ایمان کہا گیا جس کو  
بات وہ خد و خال کی ہوگی

جوں دل کے ختن میں آیا ہے  
 ہر غزل اک غزال کی ہوگی  
 کب بھلا آئے گی جواب کو اس  
 جو بھی حالت سوال کی ہوگی  
 جاؤ قرار ہے دلاں شام بخیر شب بخیر  
 صحن ہوا دھواں دھواں شام بخیر شب بخیر  
 شام وصال ہے قریب صبح کمال ہے قریب  
 پھر نہ رہیں گے سرگراں شام بخیر شب بخیر  
 وجد کرے گی زندگی جسم بہ جسم جاں بہ جاں  
 جسم بہ جسم جاں بہ جاں شام بخیر شب بخیر  
 اے مرے شوق کی امنگ میرے شباب کی ترنگ  
 تجھ پہ شفق کا سائباں شام بخیر شب بخیر  
 تو مری شاعری میں ہے رنگ طراز و گل فشاں  
 تیری بہار ہے خزاں شام بخیر شب بخیر  
 تیرا خیال خواب خواب خلوت جاں کی آب و تاب  
 جسم جمیل و نوجواں شام بخیر شب بخیر  
 ہے مرا نام ارجمند تیرا حصار سر بلند  
 بانو شہر جسم و جاں شام بخیر شب بخیر  
 دید سے جان دید تک دل سے رخ امید تک  
 کوئی نہیں ہے درمیاں شام بخیر شب بخیر  
 ہو گئی دیر جاؤ تم مجھ کو گلے لگاؤ تم  
 تو مری جاں ہے میری جاں شام بخیر شب بخیر  
 شام بخیر شب بخیر موج شمیم پیریں  
 تیری مہک رہے گی یاں شام بخیر شب بخیر  
 شام ہوتی ہے یار آئے ہیں یاروں کے ہم راہ چلیں  
 آج وہاں قوالی ہوگی جون چلو درگاہ چلیں  
 اپنی گلیاں اپنے رمنے اپنے جنگل اپنی ہوا  
 چلتے چلتے وجد میں آئیں راہوں میں ہے راہ چلیں  
 جانے بستی میں جنگل ہو یا جنگل میں بستی ہو  
 ہے کیسی کچھ نا آگاہی آؤ چلو ناگاہ چلیں  
 کوچ اپنا اس شہر طرف ہے نامی ہم جس شہر کے ہیں  
 کپڑے پہاڑیں خاک ہم سر ہوں اور ہم عز و جاہ چلیں  
 راہ میں اس کی چلنا ہے تو عیش کرا دیں قدموں کو  
 چلتے جائیں چلتے جائیں یعنی خاطر خواہ چلیں  
 یہ اکثر تلخ کامی سی رہی کیا  
 محبت زک اٹھا کر اُنی تھی کیا  
 نہ کٹم ہیں نہ افعی ہیں نہ اُردر  
 ملیں گے شہر میں انسان ہی کیا  
 میں اب ہر شخص سے اکتا چکا ہوں  
 فقط کچھ دوست ہیں اور دوست بھی کیا  
 یہ ربط ہے شکایت اور یہ میں  
 جو شے سینے میں تھی وہ بجھ گئی کیا  
 محبت میں ہمیں پاس آنا تھا  
 بدن کی اشتہا صادق نہ تھی کیا  
 نہیں ہے اب مجھے تم پر بھروسا  
 تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی کیا  
 جواب بوسہ سچ انگڑائیاں سچ  
 تو پھر وہ ہے وفائی جھوٹ تھی کیا  
 شکست اعتماد ذات کے وقت  
 قیامت آ رہی تھی آ گئی کیا

دل کی ہر بات دھیان میں گزری  
ساری بستی گمان میں گزری  
ازل داستان سے اس دم تک  
جو بھی گزری اک آن میں گزری  
جسم مدت تری عقوبت کی  
ایک اک لمحہ جان میں گزری  
زندگی کا تھا اپنا عیش مگر  
سب کی سب امتحان میں گزری  
ہائے وہ ناوک گزارش رنگ  
جس کی جنبش کمان میں گزری  
وہ گدائی گلی عجب تھی کم وائ  
اپنی اک آن بان میں گزری  
یوں تو ہم دم ہم دم زمیں پہ رہے  
عمر سب آسمان میں گزری  
جو تھی دل طائروں کی مہلت بود  
تا زمیں وہ اڑان میں گزری  
بود تو اک تکان ہے سو خدا  
تیری بھی کیا تکان میں گزری  
عجب اک طور ہے جو ہم ستم ایجاد رکھیں  
کہ نہ اس شخص کو بھولیں نہ اسے یاد رکھیں  
عہد اس کوچہ دل سے ہے سو اس کوچے میں  
ہے کوئی اپنی جگہ ہم جسے برباد رکھیں  
کیا کہیں کتنے ہی نکتے ہیں جو برتے نہ گئے  
خوش بدن عشق کریں اور ہمیں استاد رکھیں  
ہے ستوں اک نواحی میں ہے شہر دل کی  
تیشہ انعام کریں اور کوئی فریاد رکھیں  
آشیانہ کوئی اپنا نہیں پر شوق یہ ہے  
اک قفس لائیں کہیں سے کوئی صیاد رکھیں  
ہم کو انفاس کی اپنے سے عمارت کرنی  
اس عمارت کی لبوں پر ترے بنیاد رکھیں  
وہ کیا کچھ نہ کرنے والے تھے  
بس کوئی دم میں مرنے والے تھے  
تھے گلے اور گرد باد کی شام  
اور ہم سب بکھرنے والے تھے  
وہ جو آتا تو اس کی خوشبو میں  
آج ہم رنگ بھرنے والے تھے  
صرف افسوس ہے یہ طنز نہیں  
تم نہ سنورے سنورنے والے تھے  
یوں تو مرنے والے ایک بار مگر  
ہم کئی بار مرنے والے تھے  
گزاراں ہیں گزرتے ربتے ہیں  
ہم میاں جان مرتے ربتے ہیں  
ہائے جاناں وہ ناف پیالہ ترا  
دل میں بس گھونٹ اترتے ربتے ہیں  
دل کا جلسہ بکھر گیا تو کیا  
سارے جلسے بکھرتے ربتے ہیں  
یعنی کیا کچھ بھلا دیا ہم نے  
اب تو ہم خود سے ڈرتے ربتے ہیں  
ہم سے کیا کیا خدا مکرنا ہے  
ہم خدا سے مکر تے ربتے ہیں



بے عجب اس کا حال بحر کہ ہم  
 گائے گائے سنورتے رہتے ہیں  
 دل کے سب زخم پیشہ ور ہیں میاں  
 اُن با اُن بھرتے رہتے ہیں  
 ہم ترا بحر منانے کے لیے نکلے ہیں  
 شہر میں آگ لگانے کے لیے نکلے ہیں  
 شہر کوچوں میں کرو حشر بپا آج کہ ہم  
 اس کے وعدوں کو بھلانے کے لئے نکلے ہیں  
 ہم سے جو روٹھ گیا ہے وہ بہت بے معصوم  
 ہم تو اوروں کو منانے کے لیے نکلے ہیں  
 شہر میں شور ہے وہ یوں کہ گماں کے سفری  
 اپنے ہی آپ میں آنے کے لیے نکلے ہیں  
 وہ جو تھے شہر تحیر ترے پر فن معمار  
 وہی پر فن تجھے ڈھانے کے لیے نکلے ہیں  
 رہ گزر میں تری قالین بچھانے والے  
 خون کا فرش بچھانے کے لئے نکلے ہیں  
 ہمیں کرنا ہے خداوند کی امداد سو ہم  
 دیر و کعبہ کو لڑانے کے لئے نکلے ہیں  
 سر شب اک نئی تمثیل بپا ہونی ہے  
 اور ہم پردہ اٹھانے کے لئے نکلے ہیں  
 ہمیں سیراب نئی نسل کو کرنا ہے سو ہم  
 خون میں اپنے نہانے کے لئے نکلے ہیں  
 ہم کہیں کے بھی نہیں پر یہ بے روداد اپنی  
 ہم کہیں سے بھی نہ جانے کے لئے نکلے ہیں  
 مسند غم پہ جچ رہا ہوں میں  
 اپنا سینہ کھرچ رہا ہوں میں  
 اے سگان گرسنہ ایام  
 جوں غذا تم کو بچ رہا ہوں میں  
 اندرون حصار خاموشی  
 شور کی طرح مچ رہا ہوں میں  
 وقت کا خون رایگاں ہوں مگر  
 خشک لمحوں میں رچ رہا ہوں میں  
 خون میں تر بہ تر رہا مرا نام  
 ہر زمانے کا سچ رہا ہوں میں  
 حال یہ ہے کہ اپنی حالت پر  
 غور کرنے سے بچ رہا ہوں میں  
 دید کی ایک آن میں کار دوام ہو گیا  
 وہ بھی تمام ہو گیا میں بھی تمام ہو گیا  
 اب میں ہوں اک عذاب میں اور عجب عذاب میں  
 جنت پر سکوت میں مجھ سے کلام ہو گیا  
 آہ وہ عیش راز جاں ہائے وہ عیش راز جاں  
 ہائے وہ عیش راز جاں شہر میں عام ہو گیا  
 رشتہ رنگ جاں مرا نکہت ناز سے تری  
 پختہ ہوا اور اس قدر یعنی کہ خام ہو گیا  
 پوچھ نہ وصل کا حساب حال ہے اب بہت خراب  
 رشتہ جسم و جاں کے بیچ جسم حرام ہو گیا  
 شہر کی داستان نہ پوچھ ہے یہ عجیب داستان  
 آنے سے شہریار کے شہر غلام ہو گیا  
 دل کی کہانیاں بنیں کوچہ بہ کوچہ کو ہم کو  
 سہم کے ملال شہر کو شہر میں نام ہو گیا

جوَن کی تشنگی کا تھا خوب ہی ماجرا کہ جو  
 مینا بہ مینا مے بہ مے جام بہ جام ہو گیا  
 ناف پیالے کو ترے دیکھ لیا مغاں نے جان  
 سارے ہی مے کدے کا آج کام تمام ہو گیا  
 اس کی نگاہ اٹھ گئی اور میں اٹھ کے رہ گیا  
 میری نگاہ جھک گئی اور سلام ہو گیا  
 دل گماں تھا گمانیاں تھے بہ  
 ہاں میاں داستانیاں تھے بہ  
 ہم سنے اور سنائے جاتے تھے  
 رات بھر کی کہانیاں تھے بہ  
 جانے ہم کس کی بود کا تھے ثبوت  
 جانے کس کی نشانیاں تھے بہ  
 چھوڑتے کیوں نہ ہم زمیں اپنی  
 آخرش آسمانیاں تھے بہ  
 ذرہ بھر بھی نہ تھی نمود اپنی  
 اور بھر بھی جہانیاں تھے بہ  
 ہم نہ تھے ایک آن کے بھی مگر  
 جاوداں جاودانیاں تھے بہ  
 روز اک رن تھا تیر و ترکش بن  
 تھے کمبیاں اور کمانیاں تھے بہ  
 ارغوانی تھا وہ پیالہ ناف  
 ہم جو تھے ارغوانیاں تھے بہ  
 نار پستان تھی وہ قتالہ  
 اور بوس درمیانیاں تھے بہ  
 ناگہاں تھی اک آن کہ تھی  
 ہم جو تھے ناگہانیاں تھے بہ  
 کسی سے کوئی خفا بھی نہیں رہا اب تو  
 گلا کرو کہ گلا بھی نہیں رہا اب تو  
 وہ کابشیں ہیں کہ عیش جنوں تو کیا یعنی  
 غرور ذہن رسا بھی نہیں رہا اب تو  
 شکست ذات کا اقرار اور کیا ہوگا  
 کہ ادعاے وفا بھی نہیں رہا اب تو  
 چنے ہوئے ہیں لبوں پر ترے ہزار جواب  
 شکایتوں کا مزہ بھی نہیں رہا اب تو  
 ہوں مبتلائے یقیں میری مشکلیں مت پوچھ  
 گمان عقدہ کشا بھی نہیں رہا اب تو  
 مرے وجود کا اب کیا سوال ہے یعنی  
 میں اپنے حق میں برا بھی نہیں رہا اب تو  
 یہی عطیہ صبح شب وصال ہے کیا  
 کہ سحر ناز و ادا بھی نہیں رہا اب تو  
 یقین کر جو تری آرزو میں تھا پہلے  
 وہ لطف تیرے سوا بھی نہیں رہا اب تو  
 وہ سکھ وہاں کہ خدا کی ہیں بخششیں کیا کیا  
 یہاں یہ دکھ کہ خدا بھی نہیں رہا اب تو  
 دل کو دنیا کا ہے سفر درپیش  
 اور چاروں طرف ہے گھر درپیش  
 ہے یہ عالم عجیب اور یہاں  
 ماجرا ہے عجیب تر درپیش  
 دو جہاں سے گزر گیا پھر بھی  
 میں رہا خود کو عمر بھر درپیش

اب میں کوئے عبث شتاب چلوں  
کئی اک کام ہیں ادھر درپیش  
اس کے دیدار کی امید کہاں  
جب کہ بے دید کو نظر درپیش  
اب مری جان بچ گئی یعنی  
ایک فائل کی بے سپر درپیش  
کس طرح کوچ پر کمر باندھوں  
ایک ریزن کی بے کمر درپیش  
خلوت ناز اور آئینہ  
خود نگر کو بے خود نگر درپیش  
اس نے ہم کو گمان میں رکھا  
اور پھر ہم ہی دھیان میں رکھا  
کیا قیامت نمو تھی وہ جس نے  
حشر اس کی اٹھان میں رکھا  
جوشش خوں نے اپنے فن کا حساب  
ایک چپ اک چٹان میں رکھا  
لمحے لمحے کی اپنی تھی اک شان  
تو نے ہی ایک شان میں رکھا  
ہم نے پیہم قبول و رد کر کے  
اس کو ایک امتحان میں رکھا  
تم تو اس یاد کی امان میں ہو  
اس کو کس کی امان میں رکھا  
اپنا رشتہ زمیں سے ہی رکھو  
کچھ نہیں آسمان میں رکھا  
کون سے شوق کس بوس کا نہیں  
دل مری جان تیرے بس کا نہیں  
راہ تم کارواں کی لو کہ مجھے  
شوق کچھ نغمہ جرس کا نہیں  
ہاں مرا وہ معاملہ ہے کہ اب  
کام یاران نکتہ رس کا نہیں  
ہم کہاں سے چلے ہیں اور کہاں  
کوئی اندازہ پیش و پس کا نہیں  
ہو گئی اس گلے میں عمر تمام  
پاس شعلے کو خار و خس کا نہیں  
مجھ کو خود سے جدا نہ ہونے دو  
بات یہ ہے میں اپنے بس کا نہیں  
کیا لڑائی بھلا کہ ہم میں سے  
کوئی بھی سینکڑوں برس کا نہیں  
انقلاب ایک خواب ہے سو ہے  
دل کی دنیا خراب ہے سو ہے  
ریبو تو یوں ہی محو آرایش  
باہر اک اضطراب ہے سو ہے  
تر ہے دشت اس کے عکس منظر سے  
اور خود وہ سراب ہے سو ہے  
جو بھی دشت طلب کا ہے پس رو  
وہی زریں رکاب ہے سو ہے  
شیخ صاحب لیے پھریں تیغا  
برہمن فتح یاب ہے سو ہے  
دہر آشوب ہے سوالوں کا  
اور خدا لا جواب ہے سو ہے

اس شب تیرہ ہمیشہ میں  
 روشنی ایک خواب ہے سو ہے  
 ہو کا عالم ہے یہاں نالہ گروں کے ہوتے  
 شہر خاموش ہے شوریدہ سروں کے ہوتے  
 کیوں شکستہ ہے ترا رنگ متاع صد رنگ  
 اور پھر اپنے ہی خونیں جگروں کے ہوتے  
 کار فریاد و فغاں کس لیے موقوف ہوا  
 تیرے کوچے میں ترے با بنروں کے ہوتے  
 کیا دوانوں نے ترے کوچے سے بستی سے کیا  
 ورنہ سنسان ہوں راہیں نگہروں کے ہوتے  
 جز سزا اور ہو شاید کوئی مقصود ان کا  
 جا کے زنداں میں جو رہتے ہیں گھروں کے ہوتے  
 شہر کا کام ہوا فرط حفاظت سے تمام  
 اور چھلنی ہوئے سینے سپروں کے ہوتے  
 اپنے سودا زدگان سے یہ کہا ہے اس نے  
 چل کے اب آئیو پیروں پہ سروں کے ہوتے  
 اب جو رشتوں میں بندھا ہوں تو کھلا ہے مجھ پر  
 کب پرند اڑ نہیں پاتے ہیں پروں کے ہوتے  
 سر صحرا حباب بیچے ہیں  
 لب دریا سراب بیچے ہیں  
 اور تو کیا تھا بیچنے کے لئے  
 اپنی آنکھوں کے خواب بیچے ہیں  
 خود سوال ان لبوں سے کر کے میاں  
 خود ہی ان کے جواب بیچے ہیں  
 زلف کوچوں میں شانہ کش نے ترے  
 کتنے ہی پیچ و تاب بیچے ہیں  
 شہر میں ہم خراب حالوں نے  
 حال اپنے خراب بیچے ہیں  
 جان من تیری ہے نقابی نے  
 آج کتنے نقاب بیچے ہیں  
 میری فریاد نے سکوت کے ساتھ  
 اپنے لب کے عذاب بیچے ہیں  
 دل نے کیا ہے قصد سفر گھر سمیٹ لو  
 جانا ہے اس دیار سے منظر سمیٹ لو  
 آزادگی میں شرط بھی ہے احتیاط کی  
 پرواز کا ہے اذن مگر پر سمیٹ لو  
 حملہ ہے چار سو در و دیوار شہر کا  
 سب جنگلوں کو شہر کے اندر سمیٹ لو  
 بکھرا ہوا ہوں صرصر شام فراق سے  
 اب ابھی جاؤ اور مجھے آ کر سمیٹ لو  
 رکھتا نہیں ہے کوئی نکتہ کا یاں حساب  
 جو کچھ ہے دل میں اس کو لبوں پر سمیٹ لو  
 سلسلہ جنباں اک تنہا سے روح کسی تنہا کی تھی  
 ایک آواز ابھی آئی تھی وہ آواز ہوا کی تھی  
 بے دنیائی نے اس دل کی اور بھی دنیا دار کیا  
 دل پر ایسی ٹوٹی دنیا ترک ذرا دنیا کی تھی  
 اپنے اندر ہنستا ہوں میں اور بہت شرماتا ہوں  
 خون بھی تھوکا سچ مچ تھوکا اور یہ سب چالاکی تھی  
 اپنے آپ سے جب میں گیا ہوں تب کی روایت سنتا ہوں  
 آ کر کتنے دن تک اس کی یاد مجھے پوچھا کی تھی

ہوں سودائی سودائی سا جب سے میں نے جانا ہے  
 طے وہ راہ سر سودائی میں نے ہے سودا کی تھی  
 گرد تھی بیگانہ گردی کی جو تھی نگہ میری تاہم  
 جب بھی کوئی صورت بچھڑی آنکھوں میں نہ ناک کی تھی  
 ہے یہ قصہ کتنا اچھا پر میں اچھا سمجھوں تو  
 ایک تھا کوئی جس نے یک دم یہ دنیا پیدا کی تھی  
 دل کتنا آباد ہوا جب دید کے گھر برباد ہوئے  
 وہ بچھڑا اور دھیان میں اس کے سو موسم ایجاد ہوئے  
 ناموری کی بات دگر ہے ورنہ یارو سوچو تو  
 گلگوں اب تک کتنے تیشے ہے خون فریاد ہوئے  
 لائیں گے کہاں سے بول رسیلے ہونٹوں کی ناداری میں  
 سمجھو ایک زمانہ گزرا بوسوں کی امداد ہوئے  
 تم میری اک خود مستی ہو میں ہوں تمہاری خود بینی  
 رشتے میں اک عشق کے ہم تم دونوں ہے بنیاد ہوئے  
 میرا کیا اک موج ہوا ہوں پر یوں ہے لے غنچہ دہن  
 تو نے دل کا باغ جو چھوڑا غنچے ہے استاد ہوئے  
 عشق محلے میں اب یارو کیا کوئی معشوق نہیں  
 کتنے قاتل موسم گزرے شور ہوئے فریاد ہوئے  
 ہم نے دل کو مار رکھا ہے اور جتاتے پھرتے ہیں  
 ہم دل زخمی مڑگاں خونیں ہم نہ ہوئے جلاد ہوئے  
 برق کیا ہے عکس بدن نے تیرے ہمیں اک تنگ قبا  
 تیرے بدن پر جتنے تل ہیں سارے ہم کو یاد ہوئے  
 تو نے کبھی سوچا تو ہوگا سوچا بھی اے مست ادا  
 تیری ادا کی آبادی پر کتنے گھر برباد ہوئے  
 جو کچھ بھی روداد سخن تھی ہونٹوں کی دوری سے تھی  
 جب ہونٹوں سے ہونٹ ملے تو یک دم ہے روداد ہوئے  
 خاک نشینوں سے کوچے کے کیا کیا نخوت کرتے ہیں  
 جانناں جان ترے دریاں تو فرعون و شداد ہوئے  
 شہروں میں ہی خاک اڑا لو شور مچا لو ہے جا لو  
 جن دشتوں کی سوچ رہے ہو وہ کب کے برباد ہوئے  
 سمتوں میں بکھری وہ خلوت وہ دل کی رنگ آبادی  
 یعنی وہ جو بام و در تھے یکسر گرد و باد ہوئے  
 تو نے رندوں کا حق مارا مے خانے میں رات گئے  
 شیخ کھرے سید ہیں ہم تو ہم نے سنایا شاد ہوئے  
 شوق کا بار اتار آیا ہوں  
 آج میں اس کو بار آیا ہوں  
 اف مرا آج میکدے آنا  
 یوں تو میں کتنی بار آیا ہوں  
 دوستو دوست کو سنبھالا دو  
 دور سے پا فگار آیا ہوں  
 صف آخر سے لڑ رہا تھا میں  
 اور یہاں لاش وار آیا ہوں  
 وہی دشت عذاب مایوسی  
 وہیں انجام کار آیا ہوں  
 کوئی دم بھی میں کب اندر رہا ہوں  
 لیے ہیں سانس اور باہر رہا ہوں  
 دھوئیں میں سانس ہیں سانسوں میں پل ہیں  
 میں روشندان تک بس مر رہا ہوں  
 فنا ہر دم مجھے گنتی رہی ہے  
 میں اک دم کا تھا اور دن بھر رہا ہوں

ذرا اک سانس روکا تو لگا یوں  
 کم اتنی دیر اپنے گھر رہا یوں  
 بجز اپنے میسر بے مجھے کیا  
 سو خود سے اپنی جیہیں بھر رہا یوں  
 ہمیشہ زخم پہنچے ہیں مجھے کو  
 ہمیشہ میں پس لشکر رہا یوں  
 لٹا دے نیند کے بستر پہ اے رات  
 میں دن بھر اپنی پلکوں پر رہا یوں  
 نہ ہوا نصیب قرار جاں بوس قرار بھی اب نہیں  
 ترا انتظار بہت کیا ترا انتظار بھی اب نہیں  
 تجھے کیا خبر مہ و سال نے ہمیں کیسے زخم دیے یہاں  
 تری یادگار تھی اک خلش تری یادگار بھی اب نہیں  
 نہ گلے رہے نہ گماں رہے نہ گزارشیں ہیں نہ گفتگو  
 وہ نشاط وعدہ وصل کیا ہمیں اعتبار بھی اب نہیں  
 رہے نام رشتہ رفتگان نہ شکایتیں ہیں نہ شوخیاں  
 کوئی عذر خواہ تو اب کہاں کوئی عذر دار بھی اب نہیں  
 کسے نذر دیں دل و جاں بہم کہ نہیں وہ کاکل خم بہ خم  
 کسے ہر نفس کا حساب دیں کہ شمیم یار بھی اب نہیں  
 وہ ہجوم دل زدگان کہ تھا تجھے مزہ ہو کہ بکھر گیا  
 ترے آستانے کی خیر ہو سر رہ غبار بھی اب نہیں  
 وہ جو اپنی جاں سے گزر گئے انہیں کیا خبر ہے کہ شہر میں  
 کسی جاں نثار کا ذکر کیا کوئی سوگوار بھی اب نہیں  
 نہیں اب تو اہل جنوں میں بھی وہ جو شوق شہر میں عام تھا  
 وہ جو رنگ تھا کبھی کو بہ کو سر کوئے یار بھی اب نہیں  
 بھٹکتا پھر رہا ہوں جستجو بن  
 سراپا آرزو ہوں آرزو بن  
 کوئی اس شہر کو تاراج کر دے  
 بوئی بے میری وحشت با و بو بن  
 یہ سب معجز نمائی کی بوس ہے  
 رفوگر آئے ہیں تار رفو بن  
 معاش بے دلاں پوچھو نہ یارو  
 نمو پاتے رہے رزق نمو بن  
 گزار اے شوق اب خلوت کی رانیں  
 گزارش بن گلہ بن گفتگو بن  
 نہ ہم رہے نہ وہ خوابوں کی زندگی ہی رہی  
 گماں گماں سی مہک خود کو ڈھونڈھتی ہی رہی  
 عجب طرح رخ آئندگی کا رنگ اڑا  
 دیار ذات میں از خود گذشتگی ہی رہی  
 حریم شوق کا عالم بتائیں کیا تم کو  
 حریم شوق میں بس شوق کی کمی ہی رہی  
 پس نگاہ تغافل تھی اک نگاہ کہ تھی  
 جو دل کے چہرہ حسرت کی تازگی ہی رہی  
 عجیب آئینہ پر تو تمنا تھا  
 تھی اس میں ایک اداسی کہ جو سچی ہی رہی  
 بدل گیا سبھی کچھ اس دیار بودش میں  
 گلی تھی جو تری جاں وہ تری گلی ہی رہی  
 تمام دل کے محلے اجڑ چکے تھے مگر  
 بہت دنوں تو ہنسی ہی رہی خوشی ہی رہی  
 وہ داستان تمہیں اب بھی یاد ہے کہ نہیں  
 جو خون تھوکنے والوں کی بے حسی ہی رہی

سناؤں میں کسے افسانہ خیال ملال  
تری کمی ہی رہی اور مری کمی ہی رہی  
تشنگی نے سراب ہی لکھا  
خواب دیکھا تھا خواب ہی لکھا  
ہم نے لکھا نصاب تیرہ شبی  
اور ہم صد اب و تاب ہی لکھا  
منشیاں شہود نے تا حال  
ذکر غیب و حجاب ہی لکھا  
نہ رکھا ہم نے بیش و کم کا خیال  
شوق کو بے حساب ہی لکھا  
دوستو ہم نے اپنا حال اسے  
جب بھی لکھا خراب ہی لکھا  
نہ لکھا اس نے کوئی بھی مکتوب  
پھر بھی ہم نے جواب ہی لکھا  
ہم نے اس شہر دین و دولت میں  
مسخروں کو جناب ہی لکھا  
نہ پوچھ اس کی جو اپنے اندر چھپا  
غنیمت کہ میں اپنے باہر چھپا  
مجھے یاں کسی پہ بھروسا نہیں  
میں اپنی نگاہوں سے چھپ کر چھپا  
پہنچ مخبروں کی سخن تک کہاں  
سو میں اپنے ہونٹوں پہ اکثر چھپا  
مری سن نہ رکھ اپنے پہلو میں دل  
اسے تو کسی اور کے گھر چھپا  
یہاں تیرے اندر نہیں میری خیر  
مری جاں مجھے میرے اندر چھپا  
خیالوں کی آمد میں یہ خارزار  
بے تیروں کی یلغار تو سر چھپا  
لازم ہے اپنے آپ کی امداد کچھ کروں  
سینے میں وہ خلا ہے کہ ایجاد کچھ کروں  
بر لمحہ اپنے آپ میں پاتا ہوں کچھ کمی  
بر لمحہ اپنے آپ میں ایزاد کچھ کروں  
روکار سے تو اپنی میں لگتا ہوں پائیدار  
بنیاد رہ گئی پئے بنیاد کچھ کروں  
طاری ہوا ہے لمحہ موجود اس طرح  
کچھ بھی نہ یاد آئے اگر یاد کچھ کروں  
موسم کا مجھ سے کوئی تقاضا ہے دم بہ دم  
بے سلسلہ نہیں نفس باد کچھ کروں  
وہ خیال محال کس کا تھا  
اُنہم بے مثال کس کا تھا  
سفری اپنے آپ سے تھا میں  
بجر کس کا وصال کس کا تھا  
میں تو خود میں کہیں نہ تھا موجود  
میرے لب پر سوال کس کا تھا  
تھی مری ذات اک خیال آشوب  
جانے میں ہم خیال کس کا تھا  
جب کہ میں ہر نفس تھا بے احوال  
وہ جو تھا میرا حال کس کا تھا  
دوپہر باد تند کوچہ یار  
وہ غبار ملال کس کا تھا

سب چلے جاؤ مجھ میں تاب نہیں  
نام کو بھی اب اضطراب نہیں  
خون کر دوں ترے شباب کا میں  
مجھ سا قاتل ترا شباب نہیں  
اک کتاب وجود ہے تو سہی  
شاید اس میں دعا کا باب نہیں  
تو جو پڑھتا ہے بوعلی کی کتاب  
کیا یہ عالم کوئی کتاب نہیں  
اپنی منزل نہیں کوئی فریاد  
رخش بھی اپنا بد رکاب نہیں  
ہم کتابی سدا کے ہیں لیکن  
حسب منشا کوئی کتاب نہیں  
بھول جانا نہیں گناہ اسے  
یاد کرنا اسے ثواب نہیں  
پڑھ لیا اس کی یاد کا نسخہ  
اس میں شہرت کا کوئی باب نہیں  
اک زخم بھی یاران بسمل نہیں اُنے کا  
مقتل میں پڑے رہے قاتل نہیں اُنے کا  
اب کوچ کرو یارو صحرا سے کہ سنتے ہیں  
صحرا میں اب آئندہ محفل نہیں اُنے کا  
واعظ کو خراہے میں اک دعوت حق دی تھی  
میں جان رہا تھا وہ جاہل نہیں اُنے کا  
بنیاد جہاں پہلے جو تھی وہی اب بھی ہے  
یوں حشر تو یاران یک دل نہیں اُنے کا  
بت ہے کہ خدا ہے وہ مانا ہے نہ مانوں گا  
اس شوخ سے جب تک میں خود مل نہیں اُنے کا  
گر دل کی یہ محفل ہے خرچہ بھی ہو پھر دل کا  
بابر سے تو سامان محفل نہیں اُنے کا  
وہ ناف پیالے سے سرمست کرے ورنہ  
ہو کے میں کبھی اس کا قاتل نہیں اُنے کا  
کیا یہ آفت نہیں عذاب نہیں  
دل کی حالت بہت خراب نہیں  
بود پل پل کی ہے حسابی ہے  
کہ محاسب نہیں حساب نہیں  
خوب گاؤ بجاؤ اور پیو  
ان دنوں شہر میں جناب نہیں  
سب بھٹکتے ہیں اپنی گلیوں میں  
تا بہ خود کوئی باریاب نہیں  
تو ہی میرا سوال ازل سے ہے  
اور ساجن ترا جواب نہیں  
حفظ ہے شمس باز غم مجھ کو  
پر میسر وہ مابتاب نہیں  
تجھ کو دل درد کا نہیں احساس  
سو مری پنڈلیوں کو داب نہیں  
نہیں جڑتا خیال کو بھی خیال  
خواب میں بھی تو کوئی خواب نہیں  
سطر مو اس کی زیر ناف کی بائے  
جس کی چاقو زنون کو تاب نہیں  
دھوپ اٹھاتا ہوں کہ اب سر پہ کوئی بار نہیں  
بیچ دیوار ہے اور سایہ دیوار نہیں



شہر کی گشت میں ہیں صبح سے سارے منصور  
اب تو منصور وہی ہے جو سر دار نہیں  
مت سنو مجھ سے جو آزار اٹھائے ہوں گے  
اب کے آزار یہ پھیلا ہے کہ آزار نہیں  
سوچتا ہوں کہ بھلا عمر کا حاصل کیا تھا  
عمر بھر سانس لیے اور کوئی انبار نہیں  
جن دکانوں نے لگائے تھے نگہ میں بازار  
ان دکانوں کا یہ رونا ہے کہ بازار نہیں  
اب وہ حالت ہے کہ تھک کر میں خدا ہو جاؤں  
کوئی دل دار نہیں کوئی دل آزار نہیں  
مجھ سے تم کام نہ لو کام میں لاؤ مجھ کو  
کوئی تو شہر میں ایسا ہے کہ بیکار نہیں  
یاد آشوب کا عالم تو وہ عالم ہے کہ اب  
یاد مستوں کو تری یاد بھی درکار نہیں  
وقت کو سود پہ دے اور نہ رکھ کوئی حساب  
اب بھلا کیسا زیاں کوئی خریدار نہیں  
کیا یقین اور کیا گماں چپ رہ  
شام کا وقت ہے میاں چپ رہ  
ہو گیا قصہ وجود تمام  
ہے اب آغاز داستان چپ رہ  
میں تو پہلے ہی جا چکا ہوں کہیں  
تو بھی جاناں نہیں یہاں چپ رہ  
تو اب آیا ہے حال میں اپنے  
جب زمیں ہے نہ آسمان چپ رہ  
تو جہاں تھا جہاں جہاں تھا کبھی  
تو بھی اب تو نہیں وہاں چپ رہ  
ذکر چھیڑا خدا کا پھر تو نے  
یاں ہے انساں بھی رائیگاں چپ رہ  
سارا سودا نکال دے سر سے  
اب نہیں کوئی آستان چپ رہ  
ابرمن ہو خدا ہو یا آدم  
ہو چکا سب کا امتحان چپ رہ  
درمیانی ہی اب سبھی کچھ ہے  
تو نہیں اپنے درمیاں چپ رہ  
اب کوئی بات تیری بات نہیں  
نہیں تیری تری زباں چپ رہ  
ہے یہاں ذکر حال موجوداں  
تو ہے اب از گزشتگان چپ رہ  
ہجر کی جاں کنی تمام ہوئی  
دل ہوا جوت ہے اماں چپ رہ  
دل سے ہے بہت گریز پا تو  
تو کون ہے اور ہے بھی کیا تو  
کیوں مجھ میں گنوا رہا ہے خود کو  
مجھ ایسے یہاں ہزار با تو  
ہے تیری جدائی اور میں ہوں  
ملنے ہی کہیں بچھڑ گیا تو  
پوچھے جو تجھے کوئی ذرا بھی  
جب میں نہ رہوں تو دیکھنا تو  
اک سانس ہی بس لیا ہے میں نے  
تو سانس نہ تھا سو کیا ہوا تو

ہے کون جو تیرا دھیان رکھے  
بابر مرے بس کہیں نہ جا تو  
غم ہے ہے ماجرا کئی دن سے  
جی نہیں لگ رہا کئی دن سے  
ہے شمیم و ملال و حیران ہے  
خیمہ گاہ صبا کئی دن سے  
دل محلے کی اس گلی میں بھلا  
کیوں نہیں گل مچا کئی دن سے  
وہ جو خوشبو ہے اس کے قاصد کو  
میں نہیں مل سکا کئی دن سے  
اس سے بھی اور اپنے آپ سے بھی  
ہم ہیں ہے واسطہ کئی دن سے  
میں نہ ٹھہروں نہ جان تو ٹھہرے  
کون لمحوں کے روبرو ٹھہرے  
نہ گزرنے پہ زندگی گزری  
نہ ٹھہرنے پہ چار سو ٹھہرے  
ہے مری بزم ہے دلی بھی عجیب  
دل پہ رکھوں جہاں سب تو ٹھہرے  
میں یہاں مدتوں میں آیا ہوں  
ایک ہنگامہ کو ہم کو ٹھہرے  
محفل رخصت ہمیشہ ہے  
اؤ اک حشر با و بو ٹھہرے  
اک توجہ عجب ہے سمتوں میں  
کہ نہ بولوں تو گفتگو ٹھہرے  
کچ ادا تھی بہت امید مگر  
ہم بھی جون ایک حیلہ جو ٹھہرے  
ایک چاک برہنگی ہے وجود  
پیرہن ہو تو ہے رفو ٹھہرے  
میں جو ہوں کیا نہیں ہوں میں خود بھی  
خود سے بات آج دو بدو ٹھہرے  
باغ جاں سے ملا نہ کوئی ثمر  
جون ہم تو نمو نمو ٹھہرے  
شام تک میری بیکلی ہے شراب  
شام کو میری سر خوشی ہے شراب  
جہل واعظ کا اس کو راس آئے  
صاحبو میری آگہی ہے شراب  
رنگ رس ہے میری رگوں میں رواں  
بخدا میری زندگی ہے شراب  
ناز ہے اپنی دلبری پہ مجھے  
میرا دل میری دلبری ہے شراب  
ہے غنیمت جو ہوش میں نہیں میں  
شیخ تجھ کو بچا رہی ہے شراب  
حس جو ہوتی تو جانے کیا کرتا  
مفتیوں میری ہے حسی ہے شراب  
کیا کہیں تم سے بود و باش اپنی  
کام ہی کیا وہی تلاش اپنی  
کوئی دم ایسی زندگی بھی کریں  
اپنا سینہ ہو اور خراش اپنی  
اپنے ہی تیشہ ندامت سے  
ذات ہے اب تو پاش پاش اپنی

بے لبوں پر نفس زنی کی دکان  
 باوہ گوئی بے بس معاش اپنی  
 تیری صورت پہ ہوں نثار پہ اب  
 اور صورت کوئی تراش اپنی  
 جسم و جاں کو تو بیچ ہی ڈالا  
 اب مجھے بیچنی بے لاش اپنی  
 خواب کے رنگ دل و جاں میں سجائے بھی گئے  
 پھر وہی رنگ بہ صد طور جلانے بھی گئے  
 انہیں شہروں کو شتابی سے لپیٹا بھی گیا  
 جو عجب شوق فراخی سے بچھانے بھی گئے  
 بزم شوخی کا کسی کی کہیں کیا حال جہاں  
 دل جلانے بھی گئے اور بچھانے بھی گئے  
 پشت مٹی سے لگی جس میں ہماری لوگو  
 اسی دنگل میں ہمیں داؤ سکھانے بھی گئے  
 یاد ایام کہ اک محفل جاں تھی کہ جہاں  
 ہاتھ کھینچے بھی گئے اور ملائے بھی گئے  
 ہم کہ جس شہر میں تھے سوگ نشین احوال  
 روز اس شہر میں ہم دھوم مچانے بھی گئے  
 یاد مت رکھیو یہ روداد ہماری برگز  
 ہم تھے وہ تاج محل جون جو ڈھانے بھی گئے  
 جو گزر دشمن بے اس کا رہ گزر رکھا بے نام  
 ذات سے اپنی نہ بلنے کا سفر رکھا بے نام  
 پڑ گیا بے اک بھنور اس کو سمجھ بیٹھے ہیں گھر  
 لہر اٹھی بے لہر کا دیوار و در رکھا بے نام  
 نام جس کا بھی نکل جانے اسی پر بے مدار  
 اس کا ہونا یا نہ ہونا کیا، مگر رکھا بے نام  
 ہم یہاں خود آئے ہیں لایا نہیں کوئی ہمیں  
 اور خدا کا ہم نے اپنے نام پر رکھا بے نام  
 چاک چاک دیکھ کر پیراہن پہنائی کی  
 میں نے اپنے ہر نفس کا بخیم گر رکھا بے نام  
 میرا سینہ کوئی چھلتی بھی اگر کر دے تو کیا  
 میں نے تو اب اپنے سینے کا سپر رکھا بے نام  
 دن بوئے پر تو کہیں ہونا کسی بھی شکل میں  
 جاگ کر خوابوں نے تیرا رات بھر رکھا بے نام  
 دل کا دیار خواب میں دور تلک گزر رہا  
 پاؤں نہیں تھے درمیاں آج بڑا سفر رہا  
 ہو نہ سکا ہمیں کبھی اپنا خیال تک نصیب  
 نقش کسی خیال کا لوح خیال پر رہا  
 نقش گروں سے چابیے نقش و نگار کا حساب  
 رنگ کی بات مت کرو رنگ بہت بکھر رہا  
 جانے گماں کی وہ گلی ایسی جگہ بے کون سی  
 دیکھ رہے ہو تم کہ میں پھر وہیں جا کے مر رہا  
 دل مرے دل مجھے بھی تم اپنے خواص میں رکھو  
 یاراں تمہارے باب میں میں ہی نہ معتبر رہا  
 شہر فراق یار سے آئی بے اک خبر مجھے  
 کوچہ یاد یار سے کوئی نہیں ابھر رہا  
 نہیں نباہی خوشی سے غمی کو چھوڑ دیا  
 تمہارے بعد بھی میں نے کئی کو چھوڑ دیا  
 ہوں جو بھی جان کی جاں وہ گماں بوتے ہیں  
 سبھی تھے جان کی جاں اور سبھی کو چھوڑ دیا

شعور ایک شعور فریب ہے سو تو ہے  
 غرض کہ آگہی نا آگہی کو چھوڑ دیا  
 خیال و خواب کی اندیشگی کے سکھ جھیلے  
 خیال و خواب کی اندیشگی کو چھوڑ دیا  
 ایک گماں کا حال ہے اور فقط گماں میں ہے  
 کس نے عذاب جاں سہا کون عذاب جاں میں ہے  
 لمحہ بہ لمحہ دم بہ دم آن بہ آن رم بہ رم  
 میں بھی گزشتگان میں ہوں تو بھی گزشتگان میں ہے  
 آدم و ذات کبریا کرب میں ہیں جدا جدا  
 کیا کہوں ان کا ماجرا جو بھی ہے امتحان میں ہے  
 شاخ سے اڑ گیا پرند ہے دل شام درد مند  
 صحن میں ہے ملال سا حزن سا آسمان میں ہے  
 خود میں بھی ہے اماں ہوں میں تجھ میں بھی ہے اماں ہوں میں  
 کون سہے گا اس کا غم وہ جو مری اماں میں ہے  
 کیسا حساب کیا حساب حالت حال ہے عذاب  
 زخم نفس نفس میں ہے زیر زماں زماں میں ہے  
 اس کا فراق بھی زیاں اس کا وصال بھی زیاں  
 ایک عجیب کشمکش حلقہ ہے دلاں میں ہے  
 بود و نبود کا حساب میں نہیں جانتا مگر  
 سارے وجود کی نہیں میرے عدم کی ہاں میں ہے  
 شمشیر میری، میری سپر کس کے پاس ہے  
 دو میرا خود پر مرا سر کس کے پاس ہے  
 درپیش ایک کام ہے ہمت کا ساتھیو  
 کسنا ہے مجھ کو میری کمر کس کے پاس ہے  
 طاری ہو مجھ پہ کون سی حالت مجھے بتاؤ  
 میرا حساب نفع و ضرر کس کے پاس ہے  
 اے اہل شہر میں تو دعا گوئے شہر ہوں  
 لب پر مرے دعا ہے اثر کس کے پاس ہے  
 داد و ستد کے شہر میں ہونے کو آئی شام  
 خوابش ہے میرے پاس خبر کس کے پاس ہے  
 پر حال ہوں پہ صورت احوال کچھ نہیں  
 حیرت ہے میرے پاس نظر کس کے پاس ہے  
 اک افتاب ہے مری جیب نگاہ میں  
 پہنائی نمود سحر کس کے پاس ہے  
 قصہ کشور کا نہیں کوشک کا ہے کہ ہے  
 دروازہ سب کے پاس ہے گھر کس کے پاس ہے  
 مہمان قصر ہیں ہمیں کچھ رمز چابٹیں  
 یہ پوچھ کے بتاؤ کھنڈر کس کے پاس ہے  
 اتھلا سا ناف پیالہ ہماری نہیں تلاش  
 اے لڑکیو بتاؤ بھنور کس کے پاس ہے  
 ناخن بڑھے ہوئے ہیں مرے مجھ سے کر حذر  
 یہ جا کے دیکھ نیل کٹر کس کے پاس ہے  
 نہ کوئی بجر نہ کوئی وصال ہے شاید  
 بس ایک حالت ہے ماہ و سال ہے شاید  
 ہوا ہے دیر و حرم میں جو معتکف وہ یقین  
 تکان کشمکش احتمال ہے شاید  
 خیال و وہم سے برتر ہے اس کی ذات سو وہ  
 نہایت ہوس خد و خال ہے شاید  
 میں سطح حرف پہ تجھ کو اتار لایا ہوں  
 ترا زوال ہی میرا کمال ہے شاید

میں ایک لمحہ موجود سے ادھر نہ ادھر  
 سو جو بھی میرے لیے بے محال ہے شاید  
 وہ انہماک بر اک کام میں کہ ختم نہ ہو  
 تو کوئی بات ہوئی ہے ملال ہے شاید  
 گماں ہوا ہے یہ انبوہ سے جوابوں کے  
 سوال خود ہی جواب سوال ہے شاید  
 طفلان کوچہ گرد کے پتھر بھی کچھ نہیں  
 سودا بھی ایک وبم ہے اور سر بھی کچھ نہیں  
 میں اور خود کو تجھ سے چھپاؤں گا یعنی میں  
 لے دیکھ لے میاں مرے اندر بھی کچھ نہیں  
 بس اک غبار وبم ہے اک کوچہ گرد کا  
 دیوار بود کچھ نہیں اور در بھی کچھ نہیں  
 یہ شہر دار و محتسب و مولوی ہی کیا  
 پیر مغان و رند و قلندر بھی کچھ نہیں  
 شیخ حرام لقمہ کی پروا ہے کیوں تمہیں  
 مسجد بھی اس کی کچھ نہیں منبر بھی کچھ نہیں  
 مقدور اپنا کچھ بھی نہیں اس دیار میں  
 شاید وہ جبر ہے کہ مقدر بھی کچھ نہیں  
 جانی میں تیرے ناف پیالے پہ ہوں فدا  
 یہ اور بات ہے ترا پیکر بھی کچھ نہیں  
 یہ شب کا رقص و رنگ تو کیا سن مری کہن  
 صبح شتاب کوش کو دفتر بھی کچھ نہیں  
 بس اک غبار طور گماں کا ہے تہ بہ تہ  
 یعنی نظر بھی کچھ نہیں منظر بھی کچھ نہیں  
 ہے اب تو ایک جال سکون ہمیشگی  
 پرواز کا تو ذکر ہی کیا پر بھی کچھ نہیں  
 کتنا ڈراؤنا ہے یہ شہر نبود و بود  
 ایسا ڈراؤنا کہ یہاں ڈر بھی کچھ نہیں  
 پہلو میں ہے جو میرے کہیں اور ہے وہ شخص  
 یعنی وفائے عہد کا بستر بھی کچھ نہیں  
 نسبت میں ان کی جو ہے اذیت وہ ہے مگر  
 شہ رگ بھی کوئی شے نہیں اور سر بھی کچھ نہیں  
 یاراں تمہیں جو مجھ سے گلہ ہے تو کس لئے  
 مجھ کو تو اعتراض خدا پر بھی کچھ نہیں  
 گزرے گی جون شہر میں رشتوں کے کس طرح  
 دل میں بھی کچھ نہیں ہے زباں پر بھی کچھ نہیں  
 ترے غرور کا حلیہ بگاڑ ڈالوں گا  
 میں آج تیرا گریبان پہاڑ ڈالوں گا  
 طرح طرح کے شکوفے جو چھوڑتا ہے تو  
 میں دل کا باغ نمو ہی اجاڑ ڈالوں گا  
 کہاں کا سیل اجل تا کنار گاہ عید  
 میں ہوں عدم میں سبھی کو لتاڑ ڈالوں گا  
 بہت ادا سے تو گزرا ہے چشمہ ساروں سے  
 یہ سن کہ راہ میں تیری میں باڑ ڈالوں گا  
 شگفتگی کی تری یاد جو دلاتے ہیں  
 میں ایسے سارے ہی پودھے اکھاڑ ڈالوں گا  
 یہ طے کیا ہے کہ دریا موج مستی کو  
 سراب دشت تپیدا میں گاڑ ڈالوں گا  
 تمام نقش تمنا فریب تھے سو تھے  
 میں سارے نقش تمنا بگاڑ ڈالوں گا

جو رشتہ ہے دل جاں کا ہے سر بہ سر جھوٹا  
 سو میں تو اب دل و جاں میں دراڑ ڈالوں گا  
 جھنڈولے بالوں کی پر فتنہ اس سے کہہ دینا  
 میں اس کمین کو زندہ ہی گاڑ ڈالوں گا  
 مجھے تو اب اسے دنگل میں گندہ کرنا ہے  
 سو میں اسے برے حالوں پچھاڑ ڈالوں گا  
 کیا ہو گیا ہے گیسوئے خم دار کو ترے  
 آزاد کر رہے ہیں گرفتار کو ترے  
 اب تو بے مدتوں سے شب و روز روبرو  
 کتنے ہی دن گزر گئے دیدار کو ترے  
 کل رات چوب دار سمیت آ کے لے گیا  
 اک غول طرحدار سر دار کو ترے  
 اب اتنی کند ہو گئی دھار اے بقیں تری  
 اب روکتا نہیں ہے کوئی وار کو ترے  
 اب رشتہ مریض و مسیحا ہوا ہے خوار  
 سب پیشہ ور سمجھتے ہیں بیمار کو ترے  
 بابر نکل کے آ در و دیوار ذات سے  
 لے جانے گی ہوا در و دیوار کو ترے  
 اے رنگ اس میں سود ہے تیرا زیاں نہیں  
 خوشبو اڑا کے لے گئی زنگار کو ترے  
 دل جو اک جائے تھی دنیا ہوئی آباد اس میں  
 پہلے سنتے ہیں کہ رہتی تھی کوئی یاد اس میں  
 وہ جو تھا اپنا گمان آج بہت یاد آیا  
 تھی عجب راحت آزادی ایجاد اس میں  
 ایک ہی تو وہ مہم تھی جسے سر کرنا تھا  
 مجھے حاصل نہ کسی کی ہوئی امداد اس میں  
 ایک خوشبو میں رہی مجھ کو تلاش خد و خال  
 رنگ فصلیں مری یارو ہوئیں برباد اس میں  
 باغ جاں سے تو کبھی رات گئے گزرا ہے  
 کہتے ہیں رات میں کھیلیں ہیں پری زاد اس میں  
 دل محلے میں عجب ایک قفس تھا یارو  
 صید کو چھوڑ کے رہنے لگا صیاد اس میں  
 شہر بہ شہر کر سفر زاد سفر لیے بغیر  
 کوئی اثر کیے بغیر کوئی اثر لیے بغیر  
 کوہ و کمر میں ہم صغیر کچھ نہیں اب بجز ہوا  
 دیکھیو پلٹو نہ آج شہر سے پر لیے بغیر  
 وقت کے معرکے میں تھیں مجھ کو رعایتیں ہوس  
 میں سر معرکہ گیا اپنی سپر لیے بغیر  
 کچھ بھی ہو قتل گاہ میں حسن بدن کا ہے ضرر  
 ہم نہ کہیں سے آئیں گے دوش پہ سر لیے بغیر  
 قریم گریہ میں مرا گریہ ہنر و رانہ ہے  
 یاں سے کہیں ٹلوں گا میں داد ہنر لیے بغیر  
 اس کے بھی کچھ گلے ہیں دل ان کا حساب تم رکھو  
 دید نے اس میں کی بسر اس کی خبر لیے بغیر  
 اس کا سخن بھی جا سے ہے اور وہ یہ کہ جون تم  
 شہرہ شہر ہو تو کیا شہر میں گھر لیے بغیر  
 نہ تو دل کا نہ جاں کا دفتر ہے  
 زندگی اک زیاں کا دفتر ہے  
 پڑھ رہا ہوں میں کاغذات وجود  
 اور نہیں اور ہاں کا دفتر ہے

کوئی سوچے تو سوز کرب جاں  
 سارا دفتر گماں کا دفتر ہے  
 ہم میں سے کوئی تو کرے اصرار  
 کم زمیں آسماں کا دفتر ہے  
 بجر تعطیل جسم و جاں ہے میاں  
 وصل جسم اور جاں کا دفتر ہے  
 وہ جو دفتر ہے آسمانی تر  
 وہ میاں جی یہاں کا دفتر ہے  
 ہے جو بود و نبود کا دفتر  
 آخرش یہ کہاں کا دفتر ہے  
 جو حقیقت ہے دم بہ دم کی یاد  
 وہ تو اک داستاں کا دفتر ہے  
 ہو رہا ہے گزشتگان کا حساب  
 اور اُنندگان کا دفتر ہے  
 رنج ہے حالت سفر حال قیام رنج ہے  
 صبح بہ صبح رنج ہے شام بہ شام رنج ہے  
 اس کی شمیم زلف کا کیسے ہو شکر یہ ادا  
 جب کہ شمیم رنج ہے جب کہ مشام رنج ہے  
 صید تو کیا کہ صید کار خود بھی نہیں یہ جانتا  
 دانہ بھی رنج ہے یہاں یعنی کہ دام رنج ہے  
 معنی جاوداں جاں کچھ بھی نہیں مگر زیاں  
 سارے کلیم ہیں زبوں سارا کلام رنج ہے  
 بابا الف مری نمود رنج ہے آپ کے بقول  
 کیا مرا نام بھی ہے رنج ہاں ترا نام رنج ہے  
 کاسہ گداگری کا ہے ناف پیالہ یار کا  
 بھوک ہے وہ بدن تمام وصل تمام رنج ہے  
 جیت کے کوئی آئے تب ہاں کے کوئی آئے تب  
 جوہر تیغ شرم ہے اور نیام رنج ہے  
 دل نے پڑھا سبق تمام بود تو ہے قلق تمام  
 ہاں مرا نام رنج ہے ہاں ترا نام رنج ہے  
 پیک قضا ہے دم بہ دم جون قدم قدم شمار  
 لغزش گام رنج ہے حسن خرام رنج ہے  
 بابا الف نے شب کہا نشہ بہ نشہ کر گئے  
 جرعه بہ جرعه رنج ہے جام بہ جام رنج ہے  
 اُن پہ ہو مدار کیا بود کے روزگار کا  
 دم ہمہ دم ہے دوں یہ دم وہم دوام رنج ہے  
 رزم ہے خون کا حذر کوئی بہائے یا بہے  
 رستم و زال ہیں ملال یعنی کہ سام رنج ہے  
 مسکن ماہ و سال چھوڑ گیا  
 دل کو اس کا خیال چھوڑ گیا  
 تازہ دم جسم و جاں تھے فرقت میں  
 وصل اس کا نڈھال چھوڑ گیا  
 عہد ماضی جو تھا عجب پر حال  
 ایک ویران حال چھوڑ گیا  
 جہالا باری کے مرحلوں کا سفر  
 قافلے پانمال چھوڑ گیا  
 دل کو اب یہ بھی یاد ہو کہ نہ ہو  
 کون تھا کیا ملال چھوڑ گیا  
 میں بھی اب خود سے ہوں جواب طلب  
 وہ مجھے ہے سوال چھوڑ گیا

خود سے رشتے رہے کہاں ان کے  
غم تو جانے تھے رائیگاں ان کے  
مست ان کو گماں میں رہنے دے  
خانہ برباد ہیں گماں ان کے  
یار سکھ نیند ہو نصیب ان کو  
دکھ یہ بے دکھ ہیں بے اماں ان کے  
کتنی سرسبز تھی زمیں ان کی  
کتنے نیلے تھے آسماں ان کے  
نوحہ خوانی بے کیا ضرور انہیں  
ان کے نغمے ہیں نوحہ خواں ان کے  
کوئے جاناں میں اور کیا مانگو  
حالت حال یک صدا مانگو  
ہر نفس تم یقین منعم سے  
رزق اپنے گمان کا مانگو  
بے اگر وہ بہت ہی دل نزدیک  
اس سے دوری کا سلسلہ مانگو  
در مطلب بے کیا طلب انگیز  
کچھ نہیں واں سو کچھ بھی جا مانگو  
گوشہ گیر غبار ذات ہوں میں  
مجھ میں ہو کر مرا پتا مانگو  
منکران خدائے بخشنده  
اس سے تو اور اک خدا مانگو  
اس شکم رقص گر کے سائل ہو  
ناف پیالے کی تم عطا مانگو  
لاکھ جنجال مانگنے میں ہیں  
کچھ نہ مانگو فقط دعا مانگو  
خواب کی حالتوں کے ساتھ تیری حکایتوں میں ہیں  
ہم بھی دیار اہل دل تیری روایتوں میں ہیں  
وہ جو تھے رشتہ بائے جاں، ٹوٹ سکے بھلا کہاں  
جان وہ رشتہ بائے جاں اب بھی شکایتوں میں ہیں  
ایک غبار بے کم بے دائرہ وار پر فشاں  
قافلہ بائے کہکشاں تنگ ہیں وحشتوں میں ہیں  
وقت کی درمیانیاں کر گئیں جاں کنی کو جاں  
وہ جو عداوتیں کہ تھیں آج محبتوں میں ہیں  
پرتو رنگ بے کم بے دید میں جانشین رنگ  
رنگ کہاں ہیں رونما رنگ تو نکہتوں میں ہیں  
بے یہ وجود کی نمود اپنی نفس نفس گریز  
وقت کی ساری بستیاں، اپنی بزمیتوں میں ہیں  
گرد کا سارا خانماں بے سر دشت بے اماں  
شہر ہیں وہ جو ہر طرح گرد کی خدمتوں میں ہیں  
وہ دل و جان صورتیں جیسے کبھی نہ تھیں کہیں  
ہم انہیں صورتوں کے ہیں ہم انہیں صورتوں میں ہیں  
میں نہ سنوں گا ماجرا معرکہ بائے شوق کا  
خون گئے ہیں رائیگاں رنگ ندامتوں میں ہیں  
یہ جو سنا اک دن وہ حویلی یکسر بے آثار گری  
ہم جب بھی سائے میں بیٹھے دل پر اک دیوار گری  
جوں ہی مڑ کر دیکھا میں نے بیچ اٹھی تھی اک دیوار  
بس یوں سمجھو میرے اوپر بجلی سی اک بار گری  
دھار پہ پاؤ رکھی جائے اور ہم اس کے گھائل ٹھہریں  
میں نے دیکھا اور نظروں سے ان پلکوں کی دھار گری



گرنے والی ان تعمیروں میں بھی ایک سلیقہ تھا  
 تم اینٹوں کی پوچھ رہے ہو مٹی تک ہموار گری  
 بے داری کے بستر پر میں ان کے خواب سجاتا ہوں  
 نیند بھی جن کی ٹاٹ کے اوپر خوابوں سے نادار گری  
 خوب ہی تھی وہ قوم شہیدان یعنی سب بے زخم و خراش  
 میں بھی اس صف میں تھا شامل وہ صف جو بے وار گری  
 ہر لمحہ گھمسان کا رن بے کون اپنے اوسان میں بے  
 کون بے یہ؟ اچھا تو میں ہوں لاش تو ہاں اک یار گری  
 حواس میں تو نہ تھے پھر بھی کیا نہ کر آئے  
 کہ دار پر گئے ہم اور پھر اتر آئے  
 عجیب حال کے مجنوں تھے جو بہ عشوہ و ناز  
 بہ سوئے باد یہ محمل میں بیٹھ کر آئے  
 کبھی گئے تھے میاں جو خبر کے صحرا کی  
 وہ آئے بھی تو بگولوں کے ساتھ گھر آئے  
 کوئی جنوں نہیں سودائیان صحرا کو  
 کہ جو عذاب بھی آئے وہ شہر پر آئے  
 بتاؤ دام گرو چاہیے تمہیں اب کیا  
 پرندگان ہوا خاک پر اتر آئے  
 عجب خلوص سے رخصت کیا گیا ہم کو  
 خیال خام کا تاوان تھا سو بھر آئے  
 ذکر گل ہو خار کی باتیں کریں  
 لذت و آزار کی باتیں کریں  
 بے مشام شوق محروم شمیم  
 زلف عنبر بار کی باتیں کریں  
 دور تک خالی بے صحرائے نظر  
 آہوئے تاتار کی باتیں کریں  
 آج کچھ ناساز بے طبع خرد  
 نرگس بیمار کی باتیں کریں  
 یوسف کنعاں کا ہو کچھ تذکرہ  
 مصر کے بازار کی باتیں کریں  
 او اے خفتہ نصیبو مفلسو  
 دولت بیدار کی باتیں کریں  
 جون آو کارواں در کارواں  
 منزل دشوار کی باتیں کریں  
 شام تھی اور برگ و گل شل تھے مگر صبا بھی تھی  
 ایک عجیب سکوت تھا ایک عجب صدا بھی تھی  
 ایک ملال کا سا حال محو تھا اپنے حال میں  
 رقص و نوا تھے بے طرف محفل شب بیا بھی تھی  
 سامعہ صدائے جاں بے سروکار تھا کہ تھا  
 ایک گماں کی داستاں ہر لب نیم وا بھی تھی  
 کیا مہ و سال ماجرا ایک پلک تھی جو میاں  
 بات کی ابتدا بھی تھی بات کی انتہا بھی تھی  
 ایک سرود روشنی نیمہ شب کا خواب تھا  
 ایک خموش تیرگی سانحہ آشنا بھی تھی  
 دل ترا پیشہ گلہ کام خراب کر گیا  
 ورنہ تو ایک رنج کی حالت بے گلہ بھی تھی  
 دل کے معاملے جو تھے ان میں سے ایک یہ بھی بے  
 اک ہوس تھی دل میں جو دل سے گریز پا بھی تھی  
 بال و پر خیال کو اب نہیں سمت و سو نصیب  
 پہلے تھی اک عجب فضا اور جو پر فضا بھی تھی

خشک ہے چشمہ سار جاں زرد ہے سبزہ زار دل  
 اب تو یہ سوچے کہ یاں پہلے کبھی ہوا بھی تھی  
 کیا ہوئے آشفتمہ کاراں کیا ہوئے  
 یاد یاراں یار یاراں کیا ہوئے  
 اب تو اپنوں میں سے کوئی بھی نہیں  
 وہ پریشاں روزگاراں کیا ہوئے  
 سو رہا ہے شام ہی سے شہر دل  
 شہر کے شب زندہ داراں کیا ہوئے  
 اس کی چشم نیم وا سے ہوجھیو  
 وہ ترے مڑگاں شماراں کیا ہوئے  
 اے بہار انتظار فصل گل  
 وہ گریباں تار تاراں کیا ہوئے  
 کیا ہوئے صورت نگاراں خواب کے  
 خواب کے صورت نگاراں کیا ہوئے  
 یاد اس کی ہو گئی ہے بے اماں  
 یاد کے ہے یادگاراں کیا ہوئے  
 فرقت میں وصلت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں  
 آشوب وحدت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں  
 روح کل سے سب روحوں پر وصل کی حسرت طاری ہے  
 اک سر حکمت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں  
 بے احوالی کی حالت ہے شاید یا شاید کہ نہیں  
 پر احوالیت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں  
 مختاری کے لب سلوانا جبر عجب تر ٹھہرا ہے  
 بیجان غیرت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں  
 بابا الف ارشاد کناں ہیں پیش عدم کے بارے میں  
 حیرت ہے حیرت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں  
 معنی ہیں لفظوں سے برہم قہر خموشی عالم ہے  
 ایک عجب حجت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں  
 موجودی سے انکاری ہے اپنی ضد میں ناز وجود  
 حالت سی حالت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں  
 ہائے جانانہ کی مہماں داریاں  
 اور مجھ دل کی بدن آزاریاں  
 ڈھا گئیں دل کو تری دہلیز پر  
 تیری قتالہ سرینی بہاریاں  
 اف شکن ہائے شکم جانم تری  
 کیا کٹاریں ہیں کٹاریں کاریاں  
 ہائے تیری چھاتیوں کا تن تتاؤ  
 پھر تیری مجبوریاں ناچاریاں  
 تشنم لب ہے کب سے دل سا شیر خوار  
 تیرے دودھوں سے ہیں چشمے جاریاں  
 دکھ غرور حشر کے جانا ہے کون  
 کس نے سمجھی حشر کی دشواریاں  
 اپنے دریاں کو سنبھالے رکھئے  
 ہیں بوس کی اپنی عزت داریاں  
 ہیں سدھاری کون سے شہروں طرف  
 لڑکیاں وہ دل گلی کی ساریاں  
 خواب جو تعبیر کے بس کے نہ تھے  
 دوستوں نے ان پہ جانیں واریاں  
 خلوت مضراب ساز و ناز میں  
 چاہیے ہم کو تیری سسکاریاں

لفظ و معانی کا بہم کیوں ہے سخن  
کس زمانے میں تھیں ان میں یاریاں  
شوق کا اک داؤ ہے شوقی بھی ہے  
ہم ہیں اس کے حسن کے انکاریاں  
مجھ سے بدطوری نہ کر او شہر یار  
میرے جوتوں کے ہے تلوے خاریاں  
کھا گئیں اس ظالم و مظلوم کو  
میری مظلومی نما عیاریاں  
یہ حرامی ہیں غریبوں کے رقیب  
ہیں ملازم سب کے سب سرکاریاں  
وہ جو ہیں جیتے انہوں نے ہے طرح  
جیتنے پر ہمتیں ہیں باریاں  
تم سے جو کچھ بھی نہ کہہ پائیں میاں  
آخرش کرتی وہ کیا ہے چاریاں  
کیسا دل اور اس کے کیا غم جی  
یوں ہی باتیں بناتے ہیں ہم جی  
کیا بھلا آستین اور دامن  
کب سے پلکیں بھی اب نہیں ہم جی  
اس سے اب کوئی بات کیا کرنا  
خود سے بھی بات کیجے کم کم جی  
دل جو دل کیا تھا ایک محفل تھا  
اب ہے درہم جی اور ہریم جی  
بات ہے طور ہو گئی شاید  
زخم بھی اب نہیں ہے مرہم جی  
بار دنیا سے مان لے شاید  
دل ہمارے میں اب نہیں دم جی  
ہے یہ حسرت کے ذبح ہو جاؤں  
ہے شکن اس شکم کہ ظالم جی  
کیسے آخر نہ رنگ کھیلیں ہم  
دل لہو ہو رہا ہے جانم جی  
ہے خرابہ حسینیہ اپنا  
روز مجلس ہے اور ماتم جی  
وقت دم بھر کا کھیل ہے اس میں  
بیش از بیش ہے کم از کم جی  
ہے ازل سے ابد تلک کا حساب  
اور بس ایک پل ہے پیہم جی  
ہے شکن ہو گئی ہیں وہ رلفیں  
اس گلی میں نہیں رہے خم جی  
دشت دل کا غزال ہی نہ رہا  
اب بھلا کس سے کیجئے رم جی

Poet: Jaun Eliya